ڈاکٹر راجندر پرساد

بھارت کی ایکتا

ڈویژن

بھارت کی ایکتا

(۱۹۵۱-۶۰ء کے درمیان کی گئی تقریروں کا انتخاب)

ڈاکٹر راجندر پرساد

پبلیکیشنز ڈویژن
منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ
حکومت ہند

اس کتاب میں ڈاکٹر راجندر پرساد کی ۲۰ منتخب تقریریں درج کی گئی ہیں جو ہندوستان کی تہذیبی اور سیاسی وحدت کے موضوع پر کی گئی ہیں۔ ان تقریروں میں سابق صدر جمہوریہ نے ہندوستانی تہذیب کی بنیادی وحدت کو اُجاگر کیا ہے جو ملک کی ہزار سالہ تاریخ کا ورثہ ہے۔ انھوں نے قومی وحدت کو برقرار رکھنے، مستحکم کرنے اور افتراق و انتشار پھیلانے والے رجحانات سے بچنے پر زور دیا ہے:

—

فہرست

ہمارا اجتماعی شعور

ہندوستان کے حالات سے ناواقف کوئی غیر ملکی اگر ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں سفر کرے تو اُسے اتنی رنگا رنگی نظر آئے گی کہ وہ بڑی آسانی سے یہ سوچ سکتا ہے کہ ہندوستانی ایک قوم ہونے کی بجائے کئی قوموں کا مجموعہ ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسے اتنے دو طرح قسم کے جسمانی اختلافات نظر آئیں گے جتنے عام طور سے کسی بر اعظم میں ہوتے ہیں۔ ملک کے ایک سرے پر اُسے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں نظر آئیں گی اور پھر جب وہ دکھن کی طرف مڑے گا تو اسے وہ میدانی علاقہ نظر آئے گا جسے گنگا، جمنا اور برہم پتر سیراب کرتی ہیں۔ پھر وندھیا، ارا ولی، ست پڑا، سہیادری اور نیل گری کے پہاڑی سلسلے کے درمیان کا سطح مرتفع نظر آئے گا۔ اگر وہ پچھم سے پورب کی طرف سفر کرے گا تو بھی اسے اسی قسم کا تنوع اور رنگا رنگی نظر آئے گی۔ اسے ہر قسم کے موسم سے دو چار ہونا پڑے گا۔ ایک طرف ہمالیہ کے خطے کی سخت سردی ہے تو دوسری طرف میدانی علاقوں کی جھلسا دینے والی گرمی ہے۔ آسام کے پہاڑی علاقوں میں پانچ سو انچ سالانہ بارش ہوتی ہے تو جیسلمیر کے خشک اور ریگستانی علاقے میں سال میں پانچ انچ بارش بھی نہیں ہوتی۔ ایسا کوئی بھی اناج نہیں ہے جو ہندوستان میں نہ اُگتا ہو اور نہ ایسا کوئی پھل ہے جس کی یہاں کاشت نہ ہو سکتی ہو۔ کوئی بھی ایسی معدنی شے نہیں ہے جو یہاں کی کانوں سے نہ نکلتی ہو اور نہ کوئی ایسا پودا یا جانور ہے جو ہندوستان کے جنگلوں میں نہ پایا جاتا ہو۔

مختلف خطوں میں بسنے والے لوگوں کا مطالعہ کر کے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ آب و ہوا نے ان کی صورت شکل، ذہن، رہنے سہنے کے ڈھنگ اور خوراک پر کیا اثر ڈالا ہے۔ اسی طرح اس ملک میں بہت سے اہم زبانیں بولی جاتی ہیں، بے شمار بولیاں ان کے علاوہ بولی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مذہب

دلّی میں ۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء کو آل انڈیا کلچرل کانفرنس کی افتتاح کے موقع پر کی گئی تقریر سے اقتباس۔

کے ماننے والے ہندوستان میں بستے ہیں۔ جس طرح ہندوستان میں بولی جانے والی بے شمار بولیوں کی تعداد کا تعین کرنا مشکل ہے اسی طرح ملک کے خاص خاص مذہب کے لاتعداد فرقے ہیں اور ہر فرقے کے ماننے والوں کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ لہذا قدرتی طور پر اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوئی پریشان غیر ملکی اس رنگا رنگی کو دیکھ کر چلا اٹھے کہ ہندوستان ایک ملک نہیں ملکوں کا مجموعہ ہے' ہندوستانی ایک قوم نہیں بلکہ قوموں کا مجموعہ ہیں۔ کیونکہ اس شخص کو جو گہرائی میں نہیں جائے گا یہی اختلافات دکھلائی دیں گے لیکن غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ ان تمام اختلافات کی تہہ میں ایک ایسی ڈور ہے جو سبھوں کو اکٹھے باندھے ہوئے ہے۔ جس طرح ریشم کی ڈور میں مختلف قسم کے خوبصورت ہیروں کو پرو کر ایک نکلس تیار کیا جاتا ہے لیکن اس میں الگ الگ ہیرے کی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں ہوتی لیکن ہر ہیرا نہ صرف اپنی دلکشی سے لبھاتا ہے بلکہ دوسرے ہیروں کے حسن میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اس میں بہترے چشمے اور دھارائیں لگ بھگ ایک ہزار سال تک الگ الگ بہتی رہی ہیں لیکن پھر یہ دھارائیں مل گئیں اور ان کے سنگم سے ہندوستانی کلچر کی ایک دھارا پھوٹی جو سارے برصغیر میں بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ ہماری خواہش اور کوشش ہے کہ یہ دھارا اسی طرح بہتی رہے جیسے اب تک بہتی آئی ہے۔ اور یہ ان طاقتوں کو غیر فانی بنا دے جو اب تک زمانے کے دست برد کا مقابلہ کرتی آئی ہیں۔

ہمارے ملک میں ایک ابدی اخلاقی دھارا بہتی رہی ہے جس نے اکثر اپنے آپ کو زندہ ڈھانچے کی صورت میں مجسم کر لیا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص تھا جو اس اخلاقی قدر کا زندہ پیکر تھا۔ ایک ایسا شخص جس نے ہمیں ان قدروں کو محسوس کرایا اور ہمارے بے جان جسموں میں نئی جان ڈالی اور مردہ دلوں کو نئی خوشی اور ہمت عطا کی۔ وہ سچائی اور اہنسا جیسے غیر فانی آدرشوں کا ماننے والا تھا۔ جو کہ نہ صرف ہندوستان کے لئے اہمیت رکھتا ہے بلکہ انسانیت کے بقا کے لئے ضروری ہے۔

ہم نے اس ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قائم کی ہے جس میں نہ صرف فرد کو بلکہ پورے سماجی گروہ کو

اپنی صلاحتیں ابھارنے کا پورا موقع ملتا ہے۔ عام طور سے فرد اور سماج میں ایک طرح کا اختلاف رہتا ہے۔ فرد کو اپنی ترقی اور خوش حالی میں دلچسپی ہوتی ہے اور اگر اس سے کسی دوسرے فرد کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو لا محالہ دونوں میں نزاع پیدا ہوگا لیکن بلاشبہ اس نزاع کو ختم کیا جا سکتا ہے اگر دونوں میں سے ہر ایک اہنسا کے طریقوں پر عمل کرتے ہوئے اپنی اپنی ترقی کی راہوں پر آگے بڑھیں۔

ہمارے کلچر کی جڑیں اہنسا میں پیوست ہیں کیونکہ ہم اہنسا کے اصولوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اہنسا کا دوسرا نام یا دوسری شکل تیاگ ہے اسی طرح ہنسا (تشدد) کا دوسرا نام یا شکل ذاتی فائدے کی کوشش ہے جو اکثر خود غرضی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہمارے فلسفے کے مطابق تیاگ اور قربانی ہی کے ذریعے آدمی اپنی آتما کو بھی شانتی پہونچا سکتا تھا۔ سرُتی میں کہا گیا ہے: "اس (خدا) نے جو کچھ تمھیں عطا کیا ہے اس سے لطف اٹھاؤ"۔ اسی اصول کے مطابق ہم فرد اور فرد، فرد اور جماعت، فرقہ اور فرقہ اور قوم اور قوم کے درمیان کے نزاعی مسئلوں کو حل کرنے کے آرزومند ہیں۔ ہمارا پورا اخلاقی شعور اس اصول پر مبنی ہے۔ اسی یقین کے بدولت ہم مختلف عقیدوں کی دھاراؤں کو آزادی کے ساتھ اپنی دھارا میں کے ساتھ ملنے دیتے ہیں۔ بغیر کسی روک ٹوک کے مختلف فرقوں اور مذہبوں کو بڑھنے اور پھیلنے دیتے ہیں اور مختلف زبانوں کو پوری طرح ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔ ہم نے مختلف نسلوں کے لوگوں کو اپنے اندر جذب کیا ہے، ان کے کلچر کو اپنایا ہے اور اپنے کلچر کو ان کے کلچر کے ساتھ گھلنے ملنے پر پابندی نہیں لگائی۔ لہذا ہم نے دوسرے ملکوں کے ساتھ جو رشتے قائم کئے ہیں ان کی بنیاد محبت ہے نہ کہ جارحیت، تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملے گی کہ ہم نے طاقت استعمال کر کے دوسروں کو محکوم بنایا ہو۔ اس لئے اگر ہماری جیت ہوئی تو اس وجہ سے کہ ہم نے ان کے دلوں کو جیتا۔ لہذا ہمارے اثرات کے نشان اب بھی ساری دنیا میں نظر آئیں گے حالانکہ ہم لوگ خود کئی لحاظ سے اس اخلاقی شعور کو بھلا بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے ملکوں میں ہمارے اثرات نظر آتے ہیں۔

آج سب سے اہم مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ یہ تاریخی اخلاقی شعور جو ہمارے عام آدمیوں

کی زندگیوں کو متحرک کرنے والی خاص طاقت رہا ہے، موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات میں کس طرح ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ کوئی آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ اس بارے میں ہمارے ملک میں خیالات کی دو دھارائیں ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس جدید صنعتی دور میں ایک ایسا اخلاقی شعور جو لوگوں کو اہنسا، سچائی اور تیاگ کی تلقین کرتا ہو کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ آج کل کے معاشی نظام میں مقابلے اور مسابقت کو جو مقام حاصل ہے اس کی وجہ سے نہایت بے رحمی کے ساتھ اپنے ذاتی فائدے میں لگا رہنا چاہیئے۔ بہرحال ہمیں اس صنعتی دور کی جارحانہ انانیت کا انکساری اور خوش اخلاقی کے ان اصولوں کے ساتھ موازنہ کرنا چاہیئے جو ہمارے اخلاقی نظام میں مضمر ہیں اور ملک کی انقلابی تعمیرِ نو میں ہمیں ان کو متحرک کرنے والی طاقت اور قوت کے سرچشمہ کے طور پر اختیار کرنا چاہیئے۔

اس بات کا اظہار بے موقع نہ ہوگا کہ مغرب میں اس جارحانہ انانیت کا ناگزیر نتیجہ ایک طرف طبقاتی جنگ کے نظریئے اور دوسری طرف سنگدلانہ سیاسی اور معاشی استحصال' کی صورت میں نکلا ہے۔ اس کو سامراجیت سے تقویت بھی ملی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تہذیبی ترقی لامحالہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے مطابق ہوگی یا اس اخلاقی شعور کے ذریعے ہوگی جس کی طرف صدیوں پہلے عالموں اور سنتوں نے ہمارے عوام کو متوجہ کیا تھا۔ یہ بھی بلا شبہ درست ہے کہ اگر ہم چاہیں تو بھی ہم اپنے کو ان سائنسی ترقیوں سے الگ نہیں رکھ سکتے جو مغرب نے کی ہیں اور اس کی وجہ سے صنعت کے میدان میں جو نئی نئی دریافتیں ہوتی ہیں اس سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے ہیں۔ اور میرے خیال میں ایسی کوشش مناسب ہے اور نہ ضروری۔ صرف ہمیں اس بات کو مدنظر رکھنا ہوگا کہ ہم سائنس کو اپنے مقامی کلچر سے کس طرح ہم آہنگ کریں۔ اس سوال پر غور کرتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ ہمارے لوگوں کا تخلیقی شعور ختم یا کم نہیں ہوا ہے حالانکہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا پڑتا ہے کہ وقتاً فوقتاً ہمارے ملک کو قدرتی آفات اور انسانوں کی لائی ہوئی بربادیوں کا شکار ہونا پڑا ہے۔ سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، مختلف عقیدے پھلے پھولے پھر سمٹ کر رہ گئے،

اور ہمیں غیر ملکیوں کا تسلط اور ان کے مظالم برداشت کرنے پڑے۔ قدرت اور انسان نے مل کر مصیبتوں کے ڈھیر لگا دئے۔ اس کے باوجود ہم اپنی ہستی کو برقرار رکھنے، اپنے کلچر کو محفوظ رکھنے اور اپنی اہم اور تخلیقی قوتوں کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ اپنے تاریک ترین دور میں بھی ہم نے ایسے مفکر اور باعمل انسان پیدا کئے جو کسی زمانے میں بھی دنیا کی تاریخ میں اونچی سے اونچی جگہ پا سکتے تھے۔ اور یہ ان کا جائز حق ہوتا۔ اپنی سیاسی غلامی کے زمانے میں ہم مہاتما گاندھی جیسا باعمل، پکے عقیدے اور انقلابی خیالات کا انسان، رابندر ناتھ ٹیگور جیسا باکمال شاعر، اور شری اروبندو اور رامن مہرشی جیسے یوگی پیدا کر سکے۔ ہمارے ملک میں ایسے اسکالروں اور سائنس دانوں نے بھی جنم لیا ہے جن کو دُنیا آج تک خراجِ تحسین ادا کرتی ہے۔

ایسے حالات میں بھی جنھوں نے دُنیا کی کچھ مشہور تہذیبوں کو مٹا ڈالا۔ ہم نہ صرف اپنے وجود کو باقی رکھ سکے بلکہ اپنی ذہنی اور اخلاقی عظمت کو بھی قائم رکھ سکے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے وجود کے قائم رہنے کی خاص وجہ ہمارا وہ اجتماعی شعور ہے جس کی بنیاد اخلاقی قدروں پر ہے اور جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط، سمندروں سے زیادہ گہرا اور آسمان سے زیادہ وسیع ہے۔ جو قومیں تباہ اور برباد ہوگئیں ان کا اجتماعی شعور نسل اور زبان کے پنجرے میں مقید تھا چاہے وہ پنجرہ سونے کا ہی کیوں نہ ہو مگر بہر حال پنجرہ ہی تھا اور اس میں جو بھی بند ہو کمزور ہی ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس پنجرے کو توڑنے یا بدلنے کی ضرورت ہوئی تو قومی شعور بالکل بے حس حتیٰ کہ بالکل مُردہ ہوگیا تھا۔ لیکن ہمارا اجتماعی شعور یا دوسرے الفاظ میں ہمارا کلچر کبھی بھی نسلی، علاقائی یا لسانی چہار دیواری میں مقید نہیں رہا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہماری زندگی کے یہ مختلف پہلو اس کے مظہر کے مختلف وسیلے ہیں۔ نسلی، علاقائی یا لسانی باتیں ہمارے لئے کبھی ایسی رکاوٹیں نہ بنیں جنھوں نے ہمارے کلچر کو تباہ کرنے یا اس کا راستہ موڑ دینے کی کوشش کی ہو۔ اس کے برعکس ہمارے کلچر کا تانا بانا انسانیت کے دھاگوں سے بُنا گیا ہے۔ لیکن بلا شبہ یہ بھی سچ ہے کہ ہم اسے اپنی زندگی کے ہر شعبے میں سمو نہ سکے ہیں۔ ایک حد تک ہمارے زوال کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم

اسے اپنی زندگی کی روشنی نہ بنا سکے۔ لیکن یہ ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیں اس کو مناسب اہمیت دینی چاہیئے۔ دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ یہ کلچر ہماری پوری قوم کی زندگی ہے۔ صرف یہی وہ کلچر ہے جو ہمارے شہروں اور گاؤں، مختلف خطوں اور مذہبوں، مختلف طبقوں اور ذاتوں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ ان میں دوسرے لحاظ سے اختلافات تو ہو سکتے ہیں مگر یہی وہ ایک بندھن ہے جو سب کو باندھے ہوئے ہے۔ باپو نے اسی سچائی کو محسوس کیا اور اسی احساس نے ان میں اعتماد پیدا کیا کہ وہ اسی اخلاقی شعور کے سہارے ملک کے ذہین لوگوں کی رہنمائی میں عوام کو انقلاب کے دھارے میں ڈال دیں۔ عوامی ذہن نے اہنسا، خدمت اور تیاگ کی آواز پر فوراً لبیک کہا کیونکہ یہ آدرش ان کے اندر ان گنت صدیوں سے پوشیدہ تھے۔ باپو کی دُور اندیشی اس بات میں تھی کہ انھوں نے اس شعور کو عام آدمیوں کے دلوں میں بیدار کر دیا اور یہی ہمارے انقلاب کو متحرک کرنے والی خاص طاقت تھی اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز بھی پوشیدہ تھا۔ حتیٰ کہ جب عوام کا ایک طبقہ فرقہ وارانہ جذبات سے پاگل ہو گیا تھا تو بہار اور دہلی میں باپو نے اسی اخلاقی شعور کا واسطہ دے کر انھیں قابو میں کیا تھا۔

اب آپ کو اس پر غور کرنا ہے کہ کیا اس اخلاقی شعور کو موجودہ زمانے سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس میں ترمیم کی جائے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ اخلاقی شعور بنیادی طور پر موجودہ زمانے کی ضرورتوں کے عین مطابق ہے۔ جدید صنعتی تہذیب علاقائی، نسلی، یا لسانی حدبندیوں میں محدود نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ اس کی مزید ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوں گی۔ یہ تہذیب ایک عالمی بنیاد پر ہی قائم رہ سکتی ہے۔ میرے خیال میں مغرب میں جو کشمکش نظر آتی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی دقیانوسی سماجی نفسیات کے اثرات کے تحت ان تفریقوں کو باقی رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت بڑی نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہماری تہذیب نے ان حدبندیوں کو کبھی زیادہ اہمیت نہ دی۔ لہٰذا میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہمیں ان ناانصافیوں اور مظالم کو دُہرانا نہیں نہیں ہے جو جدید دَور کی نزاعوں کو جنم دیتے ہیں تو ہمیں اپنا معاشی نظام اپنے ملک کے تاریخی اخلاقی شعور کی بنیادوں پر بنانا ضروری ہوگا اور ذاتی فائدے اور ہوس کی بجائے بے لوثی اور سماجی

بھلائی کو اپنی معشیت کی خاص متحرک طاقت بنانا ہوگا۔

آج ہمیں ملک میں تہذیبی ہم آہنگی پیدا کرنے کے سوال کے علاوہ اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ ہم کس طرح ملک کی مختلف علاقائی زبانوں کی حسین و دلکش ادبی تخلیقوں کو عام لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ اس سے لطف اٹھائیں۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہر علاقائی زبان کی ادبی انجمنیں اپنی ادبی تخلیقوں کو دیوناگری رسم الخط میں شائع کر دیں؟ میرا خیال ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں جہاں مختلف زبان کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اگر کوئی ادبی تخلیق دیوناگری رسم الخط میں شائع کی جائے تو زیادہ لوگ اس سے لطف اٹھا سکیں گے کیونکہ یہاں پر نا گج مختلف زبانوں میں بڑی مماثلت ہے۔

مزید برآں ایک ایسی اکادمی کا قیام بڑا مناسب ہوگا جو ترجموں کے ذریعے ادبی خیالات کے لین دین کا کام کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اکادمی ملک کے ادباء میں تخلیقی تحریک پیدا کرنے، ادبی تنقید کا معیار مقرر کرنے اور اچھا اور پائیدار ادب پیدا کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔ ادب تہذیب کا ایک اہم مظہر ہے۔ دوسرے مظاہر موسیقی رقص، مصوری، فن تعمیر اور سنگ تراشی ہیں۔ ہندوستان ان مختلف شکلوں کے ذریعے اپنی قومی ایکتا کا اظہار کرتا آیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس رجحان کو مزید تقویت پہونچائیں گے اور اس میں نئی جان ڈالیں گے۔

بھائی چارے کا احساس اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی

ہمارے سامنے بہت سے مسائل ہیں، مگر بعض مسئلے بنیادی نوعیت کے ہوتے ہیں اور دوسرے

۲۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو ارنا کلم میں عوام سے خطاب۔

مسائل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مسئلہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ اتحاد ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے مذہب اور فرقے ہیں۔ بد قسمتی سے بعض اوقات کسی وجہ سے یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی باقی نہیں رہتی۔ اگر یہ جھگڑے کبھی کبھار ہوتے تو پھر کوئی خاص بات نہ تھی کیونکہ بھائی بھائی، میاں بیوی اور باپ اور بیٹے میں بھی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے جھگڑے فوراً ختم ہو جاتے ہیں اور آپس میں شفقت و محبت کا جو جذبہ ہوتا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اسی طرح اگر کوئی فرقہ کبھی کبھار کسی دوسرے فرقے کے ساتھ لڑ پڑے تو اُسے ایک مستقل مخاصمت یا کوئی ایسی پرخاش نہیں سمجھنا چاہیئے جو ہمیشہ باقی رہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ ہندو اور مسلمان، عیسائی اور یہودی صدیوں سے یہاں امن اور چین کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ میری طرح کا اتفاقی طور پر آنے والا شخص بھی یہاں کی سڑکوں سے گذرتے ہوئے مندروں، کلیساؤں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں کو ساتھ ساتھ دیکھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہو سکا ہے جبکہ رواداری رہی ہے اور تمام مذاہب کا خیال رکھا گیا ہے۔

میرا عقیدہ ہے اور ہر مذہب کے سچے پیروؤں کا بھی یہی عقیدہ ہوتا ہے کہ سچا مذہب کسی فوق الفطرت طاقت میں یقین رکھتا ہے۔ اور چونکہ یہ فوق الفطرت طاقت سب سے بلند و برتر ہے اور تمام دوسرے لوگ اس ہستی کے بچے جیسے ہیں اس لئے تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی اور بہن جیسا ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اگر تمام مذہبوں کی یہی تعلیم ہے تو طریقۂ عبادت میں اختلاف ہونے کے باوجود اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ انسان سچ مچ ایک دوسرے کے بھائی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں ہمارے پرکھوں یعنی پرانے زمانے کے رشیوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا اور قطعی طور پر یہ واضح کر دیا تھا کہ سچائی ایک ہے لیکن عقلمند لوگ مختلف راستے سے یہاں تک پہونچتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سچائی کا یہ احساس محض ہمارا ذہنی عقیدہ نہ بنا رہے بلکہ ہمارا معمول بن جائے جس پہ ہم زندگی کے ہر لمحے میں عمل کریں۔ سچائی کے اس احساس کے بغیر کسی بھی بلندی تک پہونچنا ہمارے ناممکن ہوگا۔ اگر ہم آپس میں لڑتے

رہے تو ظاہر ہے کہ ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ وہ ساری کوششیں جو ایک دوسرے کو دبانے میں ضائع ہوتی ہیں اسے ہم اپنی مشترکہ خوش حالی کے حصول میں بڑی اچھی طرح لگا سکتے ہیں یہ ان بنیادی مسئلوں میں سے ایک ہے جسے یہ ملک زمانۂ قدیم سے حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور آج اس مسئلے پر دوبارہ زور دینے کی ضرورت اس لئے زیادہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو غیر ملکی غلامی سے آزاد کرا لیا ہے اور اب اپنی قسمت بنانا ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔

دوسرا بنیادی مسئلہ جو قدرتی طور پر سبھوں کو متاثر کرتا ہے وہ ہمارا معاشی نظام ہے۔ اس ملک میں کروڑوں انسان بستے ہیں۔ ان میں بہتیرے بہت غریب ہیں۔ نہ انھیں پیٹ بھر کھانا میسر ہے اور نہ کافی کپڑا اور نہ ہی سر چھپانے کی کوئی جگہ ہے۔ اس ملک میں ایسی زندگی گذارنے والے لاکھوں مرد اور عورتیں ہوں گی۔ اس کے برعکس مٹھی بھر لوگ متمول اور خوش حال ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ جو لوگ اوپر ہیں انھیں دبایا جائے بلکہ یہ ہے کہ جو لوگ نیچے ہیں انھیں اوپر اٹھایا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا بھی کوئی طریقہ کار ہو سکتا ہے جو اوپر اٹھانے کے بجائے نیچے کی طرف لائے۔ واقعی ضرورت اس بات کی ہے کہ عام لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کیا جائے۔ جب کوئی غریب آدمی اپنے پڑوسی کو خوش اور مالدار دیکھتا ہے تو بعض اوقات اس میں حسد اور جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک فطری جبلت ہے اور ہمیں اسے برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن ہمیں اس کی وضاحت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ دونوں زیادہ خوش ہوں گے اگر وہ اوپر اٹھ جائیں اور خوش حال اور مال دار کو نیچے لانے کی کوئی کوشش نہ ہو۔

مہاتما جی نے اہنسا پر زور دیا ہے۔ ایک منظم اور مہذب سماج کی بنیاد صرف اہنسا پر قائم کی جا سکتی ہے۔ تشدد سے تشدد پر قابو پانے کی امید میں کوئی تشدد کرنا بالکل بے کار ہے۔ شمالی ہندوستان میں ایک کہاوت ہے کہ کیچڑ سے کیچڑ صاف نہیں کیا جا سکتا۔ کیچڑ کو دھونے کے لئے صاف پانی چاہئے۔ تشدد (ہنسا) سے چھٹکارا پانے کے لئے آپ کو تشدد سے کہیں زیادہ بہتر شے کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ شے عدم تشدد (اہنسا) ہے جس کی مہاتما گاندھی نے

تعلیم دی ہے۔ ان کی دُوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اتنے مذہب اور اتنی زبانیں ہیں جب تک اہنسا روزمرہ کی زندگی کا معمول نہ بن جائے اس وقت تک ہمارے مسائل کا کوئی حل اور ہمارے جھگڑوں کا کوئی انت نہ ہوگا۔ یہ بات صرف ہم لوگوں کے لئے ہی صحیح نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے لئے بھی درست ہے۔ ساری دنیا کُل ہے اور ہندوستان اس کا جُزو ہے۔ لہٰذا جب کبھی بھی میرے لئے ممکن ہوا ہے میں نے اہنسا کی ضرورت پر زور دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں اپنی روزمرّہ کی زندگی میں ایک دُوسرے کے ساتھ حتیٰ کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات رکھنے میں اہنسا کو بنیادی جگہ دینی چاہیئے۔ بلاشبہ ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب ہمیں مجبوراً اپنے سوچے سمجھے اور بہتر فیصلے کے خلاف کرنا پڑتا ہے۔ ایسی مجبوری سمجھ میں آتی ہے اور اُسے درگذر کرنے کے بھی تیار رہنا چاہئے۔ لیکن اگر ہم جان بوجھ کر اس راستے سے ہٹ جائیں تو پھر یہ ایک بیماری ہے۔ ہمیں اہنسا کے ذریعے اپنی زندگیوں کو بنانے کی سچّی کوشش کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے دلوں میں اس کی سچّی لگن ہے تو پھر صحیح راستے سے بھٹک بھی جائیں تو کوئی بات نہیں کیونکہ انجام کار ہم صحیح راستہ پر آجانے کے قابل ہوسکیں گے۔ جس طرح رات کے بعد صبح کا اُجالا نمودار ہوتا ہے اسی طرح وہ تمام مشکلیں جن کا ہمیں سامنا ہے دُور ہو جائیں گی اگر ہم اسے اچھی طرح محسوس کرلیں۔ اگر ہم ایک بار پوری سچائی کو اچھّی طرح محسوس کرلیں تو پھر ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو حل نہ ہوسکے۔ اس لئے گاندھی جی نے جو کچھ کہا ہے ہمیں اس کا پورا پورا لحاظ کرنا چاہیے۔ ہم صرف ان کا نام لے لے کر ہی خوش نہ ہوں بلکہ اس راہ پر بھی چلیں جو انھوں نے ہمارے لئے طے کردی ہے۔ دوستو، میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس سے بہتر کچھ اور نہیں کر سکتے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اس راستے پر چلنے کی سچّی اور پُرخلوص کوشش ہونی چاہئے۔ اور جب ایسا سوچا جائے گا تو باقی مرحلے آسان ہو جائیں گے۔

تامل زبان اور کلچر

آپ کو اپنی زبان اور کلچر پر بجا طور پر فخر ہے۔ آپ نے ملک کے اس حصے میں یا اس سے باہر جہاں کہیں بھی گئے ہیں اسے باقی رکھا ہے۔ آپ ملک کی عام تہذیبی زندگی میں اپنا حصّہ لینے کی بات جائز طور سے سوچ رہے ہوں گے۔ ہندوستان کی تہذیب ایک ملی جلی تہذیب ہے اور اس میں ملک کے ہر حصّے نے رنگ بھرا ہے۔ ہزاروں سال میں ہم ان تمام اختلافات اور رنگا رنگیوں کے باوجود ہم یک رنگی اور ایکتا اور تہذیبی اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس پر ہم ہمیشہ فخر کریں گے۔

اس ملک میں کبھی ایسی کوشش نہیں ہوئی کہ ملک کے اندر یا باہر کسی پر کوئی چیز جبراً عائد کر دی جائے۔ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی کہ ہندوستان والوں نے کسی دوسرے ملک پر حملہ کیا ہو۔ ملک کے اندر بھی ہر گروپ اور ہر حصّے کو اس کی پوری آزادی دی گئی کہ وہ اپنے مطابق جس طرح چاہے ترقی کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے بہت سی ترقی یافتہ زبانیں موجود ہیں جن کے ادبی خزانے مالا مال ہیں اور ان میں بہت سے بیش قیمت جواہرات بھی ہیں۔

اس وقت جبکہ ہم ہندوستان کی تعمیرِ نو میں مصروف ہیں آپ کو اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے پوری طرح تیار رہنا چاہیئے۔ ملک میں جو مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور جن کا اپنا ادب ہے انھیں ممکن حد تک ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ بلا شبہ یہ بہت ضروری ہے کہ تمام زبانوں کو ترقی کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے بغیر ہم ایسا ہندوستان تعمیر نہیں کر سکتے جیسا کہ ہم بنانا چاہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک ایسی زبان کی بھی ضرورت ہے۔ جس کی مدد سے ہم

تھرکورل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مدراس، کے افتتاح کے موقع پر تقریر۔ ۷ را پریل ۱۹۵۱ء

اُتر سے دکھن تک اور پورب سے پچھم تک ایک دوسرے کے ساتھ مراسلت کرسکیں اور ایک دوسرے کی باتیں سمجھ سکیں۔ پہلے زمانے میں ہم اس مقصد کے لئے سنسکرت استعمال کرتے تھے۔ صرف اسی محدود مقصد کے لئے ہمیں کسی ایک زبان کی ضرورت ہے۔ اس سے ہمیں، اختلافات کے باوجود یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ ہم ایک ہیں۔

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ تامل زبان کو ترقی دینے میں آپ کو ملک کے ہر سمجھ دار آدمی کی حمایت حاصل ہوگی۔ جس طرح آپ ہمیں سیاسی اور سماجی کارکن اور منتظم دے رہے ہیں اسی طرح ہم آپ کو ادیب دینا چاہتے ہیں جو نہ صرف ان لوگوں کو متاثر کریں گے جو تامل زبان بولتے اور سمجھتے ہیں بلکہ ان لوگوں پر بھی اثر انداز ہوں گے جو اس زبان کو نہیں سمجھتے لیکن اس کے خزانے سے فیض یاب ہونا چاہتے ہیں۔ یہ کام اعلیٰ ادبی تخلیقوں کا ترجمہ کر کے کیا جا سکتا ہے حالانکہ یہ کٹھن کام ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں یہ اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں لگی ہوئی ہیں جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔

جدید زمانے میں کسی بڑے ادبی کارنامے کے سلسلے میں تحقیق کا کام کرنے والے زیادہ زور مصنف کی جائے پیدائش، جملوں کی ساخت یا قواعد کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اظہار بیان وغیرہ جیسی چیزوں پر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زیادہ توجہ ادبی کارنامے کے بجائے اس کے مصنف پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس شخص کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی اس کارنامے کی ہوتی ہے جو اس نے یادگار چھوڑی ہے۔ شمالی ہندوستان میں ہم لوگوں کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں کیونکہ ہم کالیداس کی صحیح جائے پیدائش سے بھی واقف نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے یہاں کے ریسرچ کرنے والے کورل جیسی مہان کتاب کی اصلی تعلیمات کا پرچار کرنے میں مدد دیں۔ بلا شبہ اسکالر اس عظیم مصنف کی کتاب کے تمام ایڈیشن اور مختلف قسم کے متن اور اس پر لکھی گئی شرحوں کو یکجا کریں گے۔ گذشتہ زمانے کے بہت سے بڑے ادیبوں کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔ وہ کہاں پیدا ہوئے اور کہاں کہاں رہے۔

کس زمانے میں گذرے یہ سب ہمیں نہیں معلوم پھر بھی ان کی زندگی ملک کے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کا حصہ بن گئی ہیں۔ کورل صدیوں سے لاکھوں انسانوں کی زندگی کا ایک حصہ بنی ہوئی ہے حالانکہ اس کے مصنفین کے بارے میں بہت تھوڑی باتیں معلوم ہیں۔

کورل کی اشاعت کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ تمام لوگ اس کی مدد ، ہمت افزائی کریں گے۔

زبان کا مسئلہ

آپ نے آج مجھے جو عزت دی ہے میں اس کے لئے شکرگذار ہوں۔ میں اس عزت افزائی کی ہمیشہ قدر کروں گا کیونکہ یہ عزت مجھے ایک ایسی یونیورسٹی سے ملی ہے۔ جس نے نہ صرف ہمارے بولی جانے والی ایک زبان کو اپنے یہاں ذریعہ تعلیم بنایا تھا بلکہ اس زبان میں تمام سائنسی اور غیرسائنسی موضوعات پر نصابی کتابیں تیار کرنے اور شائع کرنے میں بھی سب سے پہلے قدم اُٹھایا تھا۔ گو کہ یہ کام اپنے طریقے سے کیا گیا اور جو زبان ذریعہ تعلیم کے لئے منتخب کی گئی تھی اس کے محدود ہونے کے باوجود مجھے یہ کام بڑا ہمت افزا نظر آیا کیونکہ میں اس معاملے میں کافی دلچسپی رکھتا ہوں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ جب سے میں نے عوامی معاملوں میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا ہے اس وقت سے مجھے اس مسئلے میں دلچسپی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس مسئلے پر اب رائے عامہ کافی بیدار ہو چکی ہے اور ملک کا ذہین طبقہ اور ماہرین تعلیم دونوں اس کے معترف ہیں کہ اگر ہمیں اپنی تعلیمی کوششوں کو ضائع

عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد ، دکن) کے خاص کنووکیشن کے موقع پر تقریر۔ ۳۰ ر اگست ۱۹۵۱ء

ہونے سے بچانا ہے تو یہ بالکل ضروری ہے کہ تعلیم مقامی زبانوں میں دی جائے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بعض طبقوں میں اس تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں کچھ ہچکچاہٹ نظر آتی ہے حالانکہ یہ پالیسی ہمارے پیش نظر مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہر طرح سے مناسب ہے۔

لہٰذا میں آپ کی اجازت سے اس مسئلے پر کچھ کہنا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کا ہر شخص جانتا ہے اور بصورت دیگر میں چاہتا ہوں کہ اس ملک کا ہر آدمی جان لے کہ دستور کے تحت ہندوستان کے آزاد عوام نے اپنی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ایک ایسا سماج قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں ہر فرد اور گروہ کو اس کا پورا پورا حق اور موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اُبھارے اور نکھارے۔ اس لئے یہ ہمارا فرض ہے کہ اس ملک میں ایک جمہوری نظام قائم رکھیں۔ ہر فرد کو ریاست اور مرکز کی حکومتوں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کا مساوی موقع حاصل ہے۔ ذریعہ تعلیم سے متعلق پالیسی کیا ہو اس سوال پر غور کرتے ہوئے ہم سبھوں کو اس ذمہ داری کو یاد رکھنا چاہیئے جو دستور نے عائد کی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تعلیم خود ایک طاقت ہے اور کوئی آدمی اس سے بے بہرہ رہ کر نہ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح ابھار سکتا ہے اور نہ ہی اپنے ملک اور علاقے کی حکومت کی پالیسیوں یا فیصلوں پر کوئی موثر یا مفید اثر ڈال سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات بالکل صاف ہے کہ تعلیم کا طریقہ اور ذریعہ ایسا نہ ہو کہ آدمی اور آدمی اور ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان تفریق اور امتیاز پیدا کرنے والا ہو۔

اس سے معلوم ہوگا کہ تمام قسم کی تعلیم' ابتدائی' ثانوی اور اعلیٰ' ہر قابل لحاظ لسانی گروپ کو اپنی زبان میں دی جائے۔ صرف اسی صورت میں تعلیم کی برکتیں حاصل کرنے کے لئے کسی ایک لسانی گروپ کو کسی دوسرے گروپ کے مقابلے میں زیادہ وقت' روپیہ اور محنت صرف نہیں کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی اور صورت اختیار کی گئی تو اس گروپ کے مقابلے میں جس کی زبان میں تعلیم دی جاری ہو اس گروپ کے بچوں کو جن کو دوسری زبان میں تعلیم ملے گی

وقت محسوس ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر مرحلے پر تعلیم متعلقہ علاقے کی زبان میں دی جائے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس لسانی گروپ کی قابلِ لحاظ آبادی ہو اور وہ ایک خاص علاقے میں آباد ہو لہٰذا ایسے لوگ جن کی تعداد تھوڑی ہے یا ایسے لوگ جو پورے ملک کے لسانی خطوں میں بکھرے ہوئے ہوں جائز طور سے اس کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ ان لسانی خطوں کی حکومتوں کو چاہیئے کہ وہ سب سے نیچے کے درجوں کو چھوڑ کر تعلیم دینے کا انتظام بچوں کی مادری زبان میں کریں۔ ایسے مطالبے کو مان لینے سے کتنا خرچ ہوگا اور دوسری قسم کی کون کون سی اُلجھنیں پیدا ہوں گی اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی واضح طور متعین کئے ہوئے لسانی علاقے میں دُوسری زبانیں بولنے والے تھوڑے بہت لوگ مل جائیں گے۔ اس لئے اگر ہر اسکول، ہر کالج اور ہر یونیورسٹی میں مختلف لسانی گروپوں کے بچوں کو تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے تو کتنا زیادہ خرچ ہوگا۔ اس کے علاوہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ مناسب ہے کہ کسی لسانی علاقے میں دوسرے لسانی گروپوں کے بکھرے ہوئے اور باقی ماندہ افراد اس علاقے کے لوگوں سے گھُل مل جائیں اور اپنے آپ کو ان سے بالکل الگ تھلگ نہ رکھیں کیونکہ اس طرح ان کے اور ان کے ارد گرد رہنے والی بڑی آبادی کے درمیان مُغائرت اور غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس ملک میں زبان کے مسئلے کی پیچیدگی بہت حد تک کم ہوگئی ہوتی مگر ہر لسانی گروپ نے سیاسی اور مالی حقیقتوں کو پیشِ نظر رکھا ہوتا۔

ہر علاقائی زبان کو ترقی دینی ہوگی اور اس کے ادب کو مالا مال کرنا ہوگا تاکہ یہ اظہارِ بیان کا ایک موزوں ذریعہ اور تمام قسم کے علوم، جدید اور قدیم کا خزانہ بن جائے۔ علاقائی حکومت یا حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اس کی مدد اور ہمّت افزائی کریں۔ یہ کام اچھے طریقے سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ زبان کی موجودہ شکل و صورت اور ذخیرہ الفاظ کی بنیادوں پر عمارت کھڑی کی جائے اور اس کی تعمیر میں ملک کی دُوسری زبانوں سے بھی ایسے الفاظ اور خیالات

لئے جائیں جو فطری طور پر آسانی سے اپنائے جا سکیں اور کھپ سکیں ۔ زبان کو خالص بنانے کی کوشش اگر اس بنیاد پر کی گئی کہ ان الفاظ، محاوروں حتیٰ کہ قواعد کی تراکیب کو زبان سے نکال دیا جائے جن کا تعلق اس ماخذ سے نہیں ہے جس سے یہ زبان نکلی ہے تو ایسی کوشش نہ صرف ناکامیاب رہے گی بلکہ زبان کو مالا مال کرنے کے بجائے اس کو مفلس بنا دے گی۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنی طاقت اور توانائی کو محفوظ رکھنا ہے تاکہ ہم اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ ملک سے غریبی اور جہالت کو دور کرنے میں صرف کر سکیں نہ کہ ایسے مقاصد میں خرچ کریں جنھیں اگر فتنہ انگیز نہیں تو کم سے کم بالکل غیر ضروری کہا جا سکتا ہے ۔ میری نظروں میں زبان کو خالص بنانے کی کوشش کا کوئی جواز نہیں کیونکہ زبان بہرحال مافی الضمیر کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے اور اگر کوئی لفظ لوگ آسانی سے سمجھ لیتے ہیں تو محض اس بناء پر اس کو زبان سے خارج کر دینے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس کا تعلق کسی دوسری زبان سے ہے ۔ اس کے علاوہ زبان کا ارتقا اس طرح ہونا چاہیئے کہ وہ متعلقہ لسانی علاقے کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آئے اور ان کے لئے قابل قبول ہو ۔ اس کے موضوعات، اسٹائل اور ذخیرہ الفاظ عام لوگوں کی زندگی اور زبان سے جس حد تک ممکن ہو قریب ہونا چاہیئے ۔ میرا خیال ہے کہ سماج کے دوسرے اداروں کی طرح زبان بھی عوام سے ناتا جوڑ کر کافی فائدہ اٹھا سکتی ہے ۔

علاقائی زبانوں کو ترقی دینے اور مالا مال کرنے کی فوری ضرورت سے قطع نظر ایک دوسرا سوال بھی ہے جو ہماری غور و فکر کا طالب ہے ۔ ہمارے ملک میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ ہمیں ایک ایسی مشترک زبان کی ضرورت ہے جس کے واسطے سے ہم مختلف علاقوں اور قومی زندگی کے مسائل کے بارے میں مختلف لسانی علاقوں سے رابطہ رکھ سکیں ۔ کافی سوچ بچار کے بعد دستور ساز اسمبلی نے دستور میں واضح کر دیا کہ ایسی زبان ہندی ہوگی جو دیوناگری لپی میں لکھی جائے گی ۔ اور سرکاری مقاصد کے لئے ہندوستانی ہندسوں کی بین اقوامی صورت رائج رہے گی ۔ یہ فیصلہ اتفاق رائے سے اور تمام لوگوں کے فائدے کو مدنظر رکھ کر کیا گیا

تھا۔ لہٰذا مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی کہ اس ملک کا کوئی بھی شخص یہ محسوس کرے کہ اس
فیصلے سے کسی طرح اس کے یا اس کے گروپ کے مفاد پر کوئی برا اثر پڑے گا۔ لہٰذا میں
نہیں سمجھتا کہ مجھے اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت ہے کہ ہر لسانی علاقے کے تعلیمی نظام میں
ہندی کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اس بات پر زور دینا ضروری ہے تاکہ وہ لوگ جو ہندی
کے علاوہ دوسری زبان بولتے ہیں وہ کسی بھی لحاظ سے کوئی دشواری محسوس نہ کریں۔ غیر ہندی
علاقوں کے عام تعلیمی ڈھانچے میں ہندی کس طرح کھپ سکے گی اور کس مرحلے پر ہندی
کی تعلیم شروع ہوگی اس کی تفصیلات بلا کسی تاخیر کے طے کر لی جائیں اور اس سلسلے میں جو بھی
منصوبہ بنایا جائے اس پر عمل درآمد کرنے کے اقدامات کیئے جائیں تاکہ دستور نے انگریزی
کی جگہ لینے کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے ہم اسی کے اندر ہی مرکزی حکومت کے سرکاری کاموں
کے لئے انگریزی کے بغیر کام چلانے کے قابل بن جائیں۔ اس ریاست کی تین زبانیں ہیں جو
اس علاقے کے لوگ بولتے ہیں۔ یہ زبانیں ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہیں۔ یہ ریاست
اُردو کو ترقی دینے کی مخلصانہ کوشش کر رہی ہے۔ اُردو کو میں اس زبان کی ایک دوسری
شکل یا شیلی قرار دیتا ہوں جسے دستور نے یونین کی سرکاری زبان کی حیثیت سے منظور
کیا ہے حالانکہ اس کا اپنا الگ رسم الخط اور ذخیرہ الفاظ ہے۔ اس طرح اس ریاست
کے وہی مسائل ہیں جو اس کئی بھاشاؤں والے دیس کو مجموعی طور سے حل کرنے ہیں۔ لیکن
اس ریاست میں ایک مزید بات یہ ہوئی ہے کہ اس نے عوامی مقاصد کے لئے ایک ایسی زبان
اپنائی ہے جو تینوں علاقائی زبانوں سے مختلف ہے۔ اس طرح جو تجربہ حاصل ہو اس سے ہم
کو فائدہ اٹھانا اور سبق لینا چاہیئے اور میرا خیال ہے یہ تجربہ ہمارے لئے بڑا قیمتی ثابت
ہوگا کیونکہ اس سے ہمیں وہ بنیاد مل جائے گی جس پر عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ یہ اس
یونیورسٹی کا فرض ہے کہ وہ اس بنیاد پر ایک ایسی عمارت تعمیر کرے جو اس میں چار چاند
لگائے اور ہمارے دیس کے لئے فائدہ مند ثابت ہو۔

ہندوستانی زندگی میں موسیقی

ہندوستانی موسیقی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہم سب فخر کر سکتے ہیں۔ زمانۂ دراز سے موسیقی اور گیت ہماری قومی زندگی کا ایک لازمی جزو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ غلامی کے زمانے میں جب کہ سرکاری سرپرستی اور اس کی تعلیم کی سہولتوں کا فقدان تھا۔ موسیقی ہمارے دلوں کو گرماتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے موسیقی کو کبھی لطف و نشاط کا ذریعہ قرار نہیں دیا بلکہ اس کو روحانی مسرت حاصل کرنے کا واسطہ سمجھا۔ دوسرے لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ موسیقی کا کیا تعلق ہے یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اپنے ملک کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ سنگیت جنم سے لے کر موت تک ہمارا ساتھی ہے۔ ہمارے بچے کے کان جنم لیتے ہی موسیقی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے تمام سنسکار، رسمیں اور منتر وغیرہ موسیقی کی مدھر آواز کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، مزدور، اور چرخہ کاتتے ہوئے یا چاول اور گیہوں کو صاف کرتے ہوئے ہماری عورتیں کچھ گنگناتی رہتی ہیں یا ساتھ مل کر گاتی ہیں۔ بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ کیا خدا نے ہمیں تال اور لے کے معاملے میں زیادہ حساس بنایا ہے۔ سنگیت ہر ایک کی روح میں رسی بسی ہوئی ہے۔ ایک ہندوستانی کو سنگیت سے کوئی وقتی مسرت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس سے اس کی روح کو گہرا اور دیرپا سکون حاصل ہوتا ہے۔

موسیقی کی جھنکار اور گونج میں تمام جھگڑے اور تنازعے وقتی طور پر لوگ بھول جاتے ہیں۔ موسیقی روح کی زبان ہے، یہ انسانیت کی آواز ہے۔ سنگیت رنگ و نسل، عقیدہ اور مقام کے تمام امتیازات سے بالاتر ہے۔ یہ وقت کی قید سے بھی آزاد ہے۔ انسان کی

بھارتی کلاکندر کے ذریعہ منعقد کی گئی موسیقی کی ایک تقریب کا افتتاحی تقریر کا ایک حصہ۔ نئی دلی۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۵۲ء

زندگی میں یہ تخلیقی تحریک پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے میرا اور چیتنہ جیسے صوفی سنگیت کے دیوانے تھے۔ کبیر، تلسی، سور، تکا رام، اور نارسی مہتہ جیسے بھگتوں اور سنتوں کے بھجن اور گیت ہماری جنتا کی زندگی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ حتیٰ کہ رادھا اور کرشن سے متعلق ہمارا ادب جو شاعرانہ رنگینیوں سے بھرپور ہے انجام کار ہمیں خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے ہماری موسیقی کی روایات اتنی مضبوط ہیں کہ اس نے ہندوستان کے تمام فرقوں کو ایک دھاگے میں باندھے رکھا ہے۔ کم سے کم یہ بات بالکل صاف ہے کہ دوسرے معاملوں میں اختلافات اور لڑائی جھگڑے ہوتے رہے ہیں لیکن جہاں تک ہندوستانی سنگیت کا سوال ہے ہندوستان کے تمام طبقے اور علاقے متفق رہے ہیں اور اب بھی ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہی کرتے رہیں گے۔ اس اتحاد نے کسی سیاسی مخالفت، اور مذہبی کٹڑپن کی پروا نہیں کی ہے اور نہ ہی علاقائی وفاداری اور لسانی اختلافات سے کوئی اثر قبول کیا ہے۔

بلاشبہ ہندوستان میں موسیقی کے دو اسکول ہیں۔ لیکن وہ بنیادی طور پر ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔ اصل میں موسیقی کی یہ دونوں شکلیں آخری تجزیے میں ایک نظر آئیں گی۔ یہ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ دونوں میں راگ اور سُر کے اصول ایک ہی ہیں۔ دونوں کا فرق بالکل ظاہری ہے اور کسی کو اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ ان ہی اصولوں نے ہندوستانی سنگیت کو اس کی مخصوص شکل و صورت عطا کی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ہمارے سنگیت کار ہر گھر میں مقدس موسیقی کی گونج پیدا کرنے میں کامیاب ہوں گے جیسا کہ گذشتہ زمانے میں ہمارے بھگتوں اور سنتوں نے پریم اور شانتی کا سندیسہ گھر گھر پہونچایا تھا۔ خدا کرے کہ ہمارے سنگیت کار اپنی زندگی کا مقصد انسانی بھلائی کے اسی راستے پر چل کر حاصل کریں۔

کرناٹک کا حصّہ

ہندوستان کا کلچر بلاشُبہ ایک ہے مگر یہ ایک ملا جُلا کلچر، ایک اجتماعی تصوّر ہے کیونکہ اس کو بنانے میں ہندوستان کے ہر حصّے نے اپنی مخصوص ذہانت کے مطابق حصّہ لیا ہے۔ ہندوستان کلچر کو بنانے میں کرناٹک نے جو حصّہ لیا ہے اس کے لئے آپ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

میں ہندوستانی کلچر کی خاص خصوصیتوں کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بنیادی طور پر بڑی ہم آہنگی ہے۔ محض ظاہری ہم آہنگی نہیں بلکہ اتنی گہری ہے کہ اس کے تانے بانے کے ہر دھاگے میں نظر آتی ہے۔ اگر کوئی شخص سفر کرے اور ملک کے مختلف حصّوں میں جائے تو وہ تمام ظاہری تنوع اور رنگا رنگی کے درمیان ہم آہنگی اور وحدت کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جائے گا۔ یہ واضح اور بیّن اثرات ہندوستانی کلچر کو ممتاز بناتے ہیں۔ لہذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ شمالی ہندوستان کے کسی آدمی کو جنوبی ہندوستان کے آرٹ میں وحدت اور ہم رنگی کی جھلکیاں نظر آئیں یا جنوبی ہندوستان کے کسی آدمی کو شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے مندروں میں ایک ہی قسم کا ڈیزائن، یا مصوری کی بنیادی خصوصیت ایک جیسی نظر آئے۔

اتحاد اور یکسانیت کا یہ جذبہ خاص طور سے موسیقی، رقص اور فنِ تعمیر جیسے فنون لطیفہ میں کارفرما نظر آتا ہے۔ موخر الذکر کے بارے میں سسر کمار متر انے کہا ہے "اگر فنِ تعمیر تمام فنون اور حرفوں کا مخزن ہے تو ہندوستان کے لئے یہ بات زیادہ صحیح ہے جس کے مندر اور گپھاؤں کے اندر بنی ہوئی عبادت گاہیں سنگ تراشی اور مصوّری کے تمام تر آرائشی

کنڑ کلچرل فیسٹول کے افتتاح کے موقع پر تقریر۔ نئی دلّی۔ ۱۵ اپریل ۱۹۵۴ء۔

حسن کے ساتھ آرٹ کی عملی بصیرت کی مظہر ہیں جو قدیم ہندوستان کے معماروں کو حاصل تھی۔ چونکہ ان کی تشکیل روحانی تصورات سے ہوئی ہے اس لئے یہ قوم کی تہذیبی ارتقاء کے مترقی اور معنوی شواہد اور اس کی خدا پرستی کے جذبات کی یک جہتی کی علامت کی حیثیت سے آج تک باقی ہیں۔"

آپ کی زبان کنڑ ہندوستان کی ایک علاقائی زبان تسلیم کی گئی ہے اور یہ ہندوستان کی پرانی زبانوں میں سے ایک ہے۔ تقریباً دو ہزار سال سے یہ زبان رائج ہے اور اس کا ادبی خزانہ مالامال ہے۔ کنڑ والوں نے سنسکرت ادب میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

دکھنی بھارت کے لوگوں کو عموماً اور کرناٹک کے لوگوں کو خصوصاً اس بات پر فخر محسوس کرنا چاہیئے کہ گیارھویں اور بارھویں صدی میں ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی عظیم تحریک ملک کے اسی حصّے سے اُٹھی تھی۔ نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک جو آگے چل کر بھگتی تحریک میں بدل گئی دور متوسط کی ہندوستانی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ کرناٹک میں جنم لینے والے مادھو آچاریہ اور یہاں پناہ لینے والے رامانج دونوں ہی اس تحریک کے پیش رو تھے۔ نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک تقریباً سارے شمالی ہندوستان میں پھیل گئی اور اس کا ایک سب سے نمایاں نتیجہ عظیم مذہبی بیداری کی صورت میں نکلا۔ اس کا اظہار بھگتی اور معرفت کی شاعری کے ذریعہ ہوا ہے۔ ہندی جو کئی صدیوں سے تشکیل و ترتیب پا رہی تھی اسے اس مذہبی جوش وخروش نے کافی بڑھاوا دیا۔ حتیٰ کہ آج بھی بھگتی کال کا ادب ہندی ساہتیہ کا انمول خزانہ ہے۔ اس لئے ہم ایک طرح سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے حالات پیدا کرنے میں جنوبی ہندوستان نے بڑا نمایاں حصّہ لیا ہے جس سے ہندی ادب کا دامن بیش قیمت موتیوں سے بھر گیا۔ بنگلہ اور مراٹھی زبانوں کو بھی اس نشاۃ ثانیہ سے بڑا فائدہ پہونچا۔ لہٰذا ملک کے مختلف خطوں اور زبانوں کے آرٹ اور ادب میں وحدت اور ہم آہنگی کا احساس پایا جانا بالکل ناگزیر تھا۔

مجھے خوشی ہے کہ کنڑ زبان ایک بار پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہے حالانکہ تاریخی اور جغرافیائی وجوہ کی بناء پر اسے اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں عارضی طور پر کچھ دھکا لگا تھا۔ اب آپ کے یہاں دو یونیورسٹیاں ہیں اور اس علاقے میں بہت سے اچھے اچھے تعلیمی ادارے ہیں جہاں کنڑ ذریعۂ تعلیم ہے۔ کنڑ کا پریس بڑا طاقت ور ہے اور افسانے اور ناول، ڈراما اور شاعری کے لحاظ سے اس کا ادب بڑا ترقی یافتہ ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ہماری آزادی کی جدوجہد میں کنڑ زبان کے ادیبوں نے بڑا نمایاں حصّہ لیا ہے۔

مجھے یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کے جذبۂ افتخار اور آپ کے کارہائے نمایاں کی کرناٹک سے باہر بڑی قدر کی جاتی ہے۔ پورا ملک موسیقی کے کرناٹک اسٹائل کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اسے پسند کرتا ہے۔ ملک کے ان حصّوں میں بھی جہاں کنڑ زبان نہیں بولی جاتی لوگ یہ سنگیت سنتے اور اس سے لطف اُٹھاتے ہیں۔

جن لوگوں نے یہ تقریب منعقد کی ہے۔ میں انھیں کنڑ کلچرل فیسٹول بنانے کے فیصلے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ایسی تقریبیں ایک اعلیٰ قسم کی تفریح مہیّا کرنے کے علاوہ قومی لحاظ سے بڑی اہم ہوتی ہیں۔ اس سے دوسری زبان بولنے والوں کو علاقائی ادب اور آرٹ کے نزدیک آنے کا موقع ملتا ہے۔ دہلی میں ایسی تقریبات کو میں خاص طور سے پسند کرتا ہوں جن میں جنوبی ہندوستان کی تہذیبی سرگرمیاں پیش کی جائیں۔ مجھے امید ہے کہ اس قسم کی تقریبیں ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہر ریاست یا خطّہ دوسرے علاقے کو کچھ نہ کچھ دے سکتا ہے۔ اور ایسی تقریبوں کو تہذیبی میدان میں لین دین کا بہترین ذریعہ ہونا چاہیئے۔

پنجابی کلچر

مجھے خوشی ہے کہ راجدھانی کے پنجابی بولنے والے شہریوں نے ایسی تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے یہاں دوسرے لسانی گروپوں کی ایسی ہی تہذیبی اور ادبی تقریبیں منعقد ہو چکی ہیں۔ دہلی میں پنجابی بولنے والوں کی تعداد غالباً کوئی ایک زبان بولنے گروپ سے کم نہیں ہے۔ اگر اس شہر کی پنجابی آبادی نے پنجابی میلہ منعقد کرنے کے بارے میں نہیں سوچا ہوتا تو یقیناً بڑا لگتا۔ جب اس کے بارے میں شری گورمکھ سنگھ مسافر اور دوسرے دوستوں نے کہا تو میں بڑی خوشی سے اس کا افتتاح کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے صرف چند ہی ترقی یافتہ اور مالا مال ہیں۔ ان کا ادب اور اپنی ادبی روایات ہیں۔ زبان اور رسم و رواج میں اس فرق ہی کی وجہ سے ہم اکثر ہندوستان کو متعدد تہذیبوں والا ملک کہتے ہیں۔ یہ تمام علاقائی کلچر اور ان کی روایات ہی وہ بنیادیں ہیں جن پر ہندوستانی کلچر کی عمارت کھڑی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی اپنی کوئی امتیازی انفرادیت نہیں ہے اور یہ محض علاقائی تہذیبوں کا ڈھیر یا تودہ ہے۔ درحقیقت صدیوں کے میل جول اور آپس کے لین دین کی وجہ سے ایک ملی جلی تہذیب نے جنم لیا جس کی اپنی خصوصیتیں اور اپنا حسن ہے۔ حالانکہ آج بھی پہلے ہی کی طرح مختلف علاقوں کا فکری انداز، رسم و رواج اور روایات ہندوستانی تہذیب کا جزو لاینفک ہیں تاہم ہندوستانی تہذیب مجموعی طور پر اپنی انفرادی خصوصیتوں کی وجہ سے ان میں ہر ایک سے بلند ہے۔

میں جانتا ہوں کچھ لوگ زبانوں کی اس کثرت کو ملک کے لئے ایک بردان نہیں سمجھتے

نئی دہلی میں ۷ نومبر ۱۹۵۴ء کو پنجابی کلچرل میلہ منعقد ہوا تھا۔ یہ تقریر اسی کے افتتاح کے موقع کی ہے۔

ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ گذشتہ زمانے میں زبانوں کی اس بہتات نے ایسے رجحانات کو ابھارا ہو جو مرکزیت کے منافی رہے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات ملک کی سالمیت اور وحدت کے لئے ایک چیلنج تصور کی گئی ہو۔ لیکن اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے، اور میں بدلے ہوئے حالات کے تحت اس کا جائزہ لوں گا۔ خوش قسمتی سے اب ہم اس سمت میں کافی آگے بڑھ آئے ہیں اور سیاسی آزادی اور قومی اتحاد کے نظریے کے اب دوسرے معانی و مطالب کے حامل ہیں۔ آج جن بنیادوں پر ہندوستان کی وحدت اور سالمیت کی عمارت کھڑی ہے وہ اتنی مضبوط ہیں کہ جو طاقتیں ماضی میں اس کے لئے خطرہ بنی ہوئی تھیں وہی اب ایسے نئے نئے رشتے اور تعلقات پیدا کرنے کی اہل ہیں جو اس کی استواری کا باعث ہوں گی۔ انڈین یونین کی چھوٹی بڑی تمام اکائیاں لسانی اور تہذیبی طور پر بالکل آزاد ہیں اور ہم ہر علاقائی زبان اور کلچر کی ترقی کو ہندوستان کے کلچر کے لئے فالِ نیک سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں دستور نے ہندوستانی جمہوریہ کی مختلف اکائیوں کو جو آزادی دی ہے وہ ہماری کامیابی کی ضمانت ہی نہیں اس کی کسوٹی بھی ہے۔

میں پنجابی زبان کے بارے میں بھی چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ دوسری ہند آریائی زبانوں کی طرح پنجابی کے خد و خال بھی دورِ متوسط میں متعین ہوئے اور ملک کی دوسری زبانوں کی طرح اس پودے کی آبیاری مذہبی رہنماؤں اور بڑے بڑے گوروؤں کی بانی سے ہوئی ہے۔ اس زبان کی اپنی خصوصیتیں اور اپنی شان و شوکت ہے۔ حالانکہ جدید پنجابی ادب گذشتہ سو برسوں کی دین ہے لیکن پنجابی زبان کے بعض ایک چند صدی پہلے لکھے گئے تھے یہ اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے نہایت قابل قدر ہیں۔ اس طرح پنجابی کی شعری روایات جن کا اظہار ان رزمیہ نظموں اور پنجاب کے لوک گیتوں میں ملتا ہے کافی پرانی ہیں۔ ان روایات کو زندہ رکھنا اور جہاں تک ممکن ہو انھیں بہتر بنانا میرے خیال میں ہمارا فرض ہے۔

اس وجہ سے میں ایسی کلچرل تقریبات کو منعقد کرنے کے خیال کو پسند کرتا ہوں کیونکہ

یہ ہمارے تہذیبی روایات کو زندہ رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میلہ راجدھانی کے پنجابی بولنے والوں کے لئے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی تفریح طبع کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ ایسی تقریبیں تفریح کے علاوہ تعلیمی قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہیں۔ دہلی جیسی جگہ میں جہاں مختلف قسم کے لوگ آباد ہیں ایسی تقریبیں اشتراک و تعاون اور باہمی لین دین کے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ میں آپ کی اس تقریب کی کامیابی کا متمنی ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ایسے مواقع ہماری شہری اور دیہاتی زندگی کی ایک مستقل خصوصیت بن جائیں گے۔

کیرالا کے آرٹ کی روایات

مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ میں ملیالم آرٹ فیسٹول کا افتتاح کرنے اور اسے دیکھنے کے لئے یہاں موجود ہوں۔ مجھے دوسرے لسانی گروہوں کے ذریعے منعقد کی گئیں اسی طرح کی تقریبوں کو دیکھنے اور ایسے اجتماعوں کی اہمیت اور ملک کی تہذیبی زندگی پر ان کے عموی اور بھارت کی ایکتا پر خصوصی اثرات کے بارے میں چند الفاظ کہنے کا موقع ملتا رہا ہے۔

جب مجھے کیرالا کے مہربان دوستوں کی طرف سے اس تقریب کی افتتاح کرنے کی دعوت ملی تو میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اتحاد و اتفاق کے جو دھاگے آپس کے میل جول اور فائدے خیالات اور نقطہ نظر کے اشتراک و ہم رنگی کی وجہ سے اگر ہزار سال میں نہ سہی لیکن کئی سو برسوں میں بٹ کر تیار ہوئے ہیں انھوں نے اس قدیم سرزمین کے مختلف، علاقائی کلچروں سے نہایت خوب صورت گل بوٹے بنائے ہیں۔ اس تنوع نے جو مختلف علاقوں کی مخصوص خصوصیتوں

دہلی میں ۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ملیالم آرٹ فیسٹول کے افتتاح کے موقع پر تقریر۔

اور روایتوں کا مظہر ہے بھارتی ایکتا کو بڑا لطیف اور رنگا رنگ بنا دیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے پورے مرقع پر مختلف علاقوں کی رنگا رنگ تہذیبوں کا گہرا اثر ہے لیکن اس کے باوجود بھارتی سنسکرتی کا تصور اتنا واضح اور صاف ہے کہ مجموعی طور پر اسے کسی ایک علاقے کی تہذیب کے برابر نہیں گردانا جا سکتا اور نہ کسی ایک علاقے کی تہذیب کو ہندوستانی کلچر کے مترادف سمجھا جا سکتا ہے۔

اگر ہم اس مسئلے پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہونچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ حالانکہ ہمارا ملک بہت بڑا ہے اور اس میں قسم قسم کے لوگ بستے ہیں لیکن اس کے باوجود وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بعض بنیادی تصورات ہمارے ملک کے طول و عرض میں اس طرح رچ گئے ہیں کہ لمبے لمبے فاصلے، آب و ہوا، زبان، اور رسم و رواج کا فرق تقریباً کوئی معنی نہیں رکھتا۔ شمال میں ہمالیہ کے برف پوش خطوں کی دیو مالائیں اور روایتی نغمے بالکل ویسے ہی ہیں جیسے جنوب میں دور دراز کیرالا کے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بڑی حد تک رامائن اور مہابھارت ہمارے دو مہان مہاکاویہ مختلف علاقوں کے فکر و خیال، ادب، اور سماجی رسوم کے درمیان رشتۂ اتحاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کو محض اتفاقی حادثہ نہیں کہا جا سکتا کہ تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں اور خصوصاً ملک کے شمالی مشرقی اور مغربی حصوں کی زبانوں میں جو اس وقت تشکیلی دور سے گذر رہی تھیں ان میں ادبی سرگرمیاں اس وقت شروع ہوئیں جب ان دو مہاکاویوں کا یا ان کے حصوں کا مقامی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ حتیٰ کہ ڈراویڈی زبانوں میں بھی کلاسیکی روایات اس وقت شروع ہوئیں جب کہ مہابھارت اور رامائن مقامی زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوئیں۔ یہ ایک نہایت اہم حقیقت ہے کہ ہماری تمام زبانوں میں پہلی ادبی کاوشیں ان رزم ناموں کے ترجموں یا ان ہی کے موضوعات پر مبنی تھیں۔ اسی وجہ سے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ کسی صاحب بصیرت کو اتحاد و اتفاق کی ایک ایسی ڈور نظر آتی ہے جو مختلف علاقوں کے ادب اور فنون کو باندھے ہوئے ہے۔

کیرالا ان مختلف لسانی اور تہذیبی علاقوں میں سے ایک ہے جس کا اپنا رسم و رواج اور اپنی فنی و ادبی روایتیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کی زبان ملیالم کا ادبی خزانہ مالا مال ہے۔ اور ناول، ڈراما اور شاعری جیسے اصناف ادب کافی ترقی یافتہ ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ کیرالا کا ایک عظیم ترین تہذیبی اثاثہ یہاں کا رقص ڈراما ہے جس کی بنیاد رامائن، اور مہابھارت کی کہانیوں پر ہے۔ یہ رقصی ڈراما اپنی جان داری، فن کارانہ اثر انگیزی، اور ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی دل کش اور رنگا رنگ لباسوں کی وجہ سے بڑے مقبول ہیں۔ جہاں تک کتھا کلی کا تعلق ہے جس کی وجہ سے آرٹ کی دنیا میں کیرالا کی شہرت ہے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آرٹ کے تمام ناقدین اس بات کے معترف ہیں کہ کتھا کلی ہندوستانی رقص کے بہترین مظاہر میں سے ایک ہے۔ اسی طرح کیرالا کے لوگوں نے موسیقی مصوری فن تعمیر، اور دوسرے فنون لطیفہ کے میدانوں میں اپنے آپ کو ممتاز کیا ہے۔

میں دہلی میں ایسی سماجی تقریبیں منعقد کرنے کو بہت پسند کرتا ہوں جو دور دراز کے علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دہلی ہر علاقے کے لوگوں کا وطن ہونے کے علاوہ ایک معنوں میں شمالی ہندوستان کا دل ہے۔ لہذا یہ نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ملک کے اس حصے کے لوگ جنوب کی دور ترین ریاست کیرالا کی ادبی اور تہذیبی روایات کے بارے میں جس قدر ممکن ہو جانیں۔ میری خواہش ہے کہ شمالی ہندوستان کے لوگ دکھن میں اپنا آرٹ فیسٹول منعقد کریں تاکہ آپس میں لین دین کا عمل جاری رہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ اس فیسٹول کو دیکھیں گے انہیں اس میں دل چسپی کا کافی سامان ملے گا۔

میں ملیالم آرٹ فیسٹول کی کامیابی کا متمنی ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اس سے غیر ملیالی لوگوں کو کیرالا کے آرٹ اور کلچر میں دل چسپی پیدا ہوگی اور ملیالیوں کو اپنے کلچر کو مالا مال بنانے کا موقع ملے گا۔

سنسکرت زبان

میں سنسکرت کا اسکالر نہیں ہوں اور نہ میں اس کا دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے اس کے مطالعہ میں اتنا وقت لگایا ہے جتنا کہ میں چاہتا ہوں۔ نہایت انکساری کے ساتھ میں صرف یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ مجھے اس زبان سے محبت ہے۔ اگر سنسکرت سے اس لگاؤ کا میں تجزیہ کروں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ لگاؤ کچھ حد تک افادے کی وجہ سے اور کچھ حد تک جذبات کی وجہ سے ہے۔

سنسکرت ہندوستان کے کلچر کی زبان ہے اور اس سے پورے ملک کو تخلیقی تحریک ملی ہے۔ اس زبان میں ماضی کی عظمت، فکر و فلسفہ، اور روحانی امنگیں محفوظ ہیں۔ دوسری دو زبانیں پالی اور پراکرت علم و آگہی کے مخزن کی حیثیت سے سنسکرت کے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں زبانوں کا سنسکرت سے گہرا تعلق ہے۔ دراصل پالی اور پراکرت کی اہمیت بذاتِ خود سنسکرت کے مطالعے کی حمایت میں ایک دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے علم کے بغیر ان دونوں سے پوری طرح لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ چاہے کوئی شخص ہندوستانی فلسفے کی مشہور شاخوں کے بارے جاننا چاہے یا موسیقی اور رقص جیسے فنونِ لطیفہ کے ارتقا کا مطالعہ کرنا چاہے یا اپنی لمبی تاریخ کی ان خلاؤں کو پُر کرنا چاہے جو یہاں وہاں نظر آئیں تو اس کے لئے سنسکرت کی واقفیت ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

میرے خیال میں سنسکرت کا مطالعہ ہمارے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا۔ سنسکرت نہ صرف فلسفہ اور آرٹ کے میدان میں ہماری گذشتہ کامیابیوں کی مظہر اور علوم کا خزانہ ہے بلکہ یہ ہماری قومی تمناؤں اور تہذیبی روایتوں کا خاص وسیلہ بھی رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان

۱۱ر نومبر ۱۹۵۵ء کو سنسکرت وشو پریشد کے سالانہ اجلاس میں صدارتی خطبہ۔

کی جدید زبانوں کا منبع بھی رہی ہے اور ان تمام زبانوں کو اسی سے تخلیقی تحریک ملی ہے۔

جنوبی ہندوستان کی چار زبانوں نے بھی جنھیں ہند آریائی زبانوں کے گروپ میں شامل نہیں کیا جا سکتا آپسی ربط اور مذہبی و تہذیبی تعلق کی وجہ سے اپنے الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ سنسکرت سے اخذ کیا ہے۔

میں نے اکثر یہ بات سُنی ہے کہ زمانۂ قدیم میں کئی سو برسوں تک سنسکرت بھارت کی ایکتا کی خاص بنیاد بنی رہی ہے۔ اس بات میں کافی صداقت ہے۔ غور کیجئے کہ دو ہزار سال پہلے جب علاقائی اور جغرافیائی لحاظ سے ہمارا ملک آج کے مقابلے میں غالباً بڑا تھا تو دور دراز پردیشوں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے ربط کیسے قائم رکھتے ہوں گے۔ اس قدیم زمانے میں جبکہ رسل و رسائل کے جدید وسیلے ناپید تھے پورے ملک میں ایک ہی قسم کا تعلیمی ڈھانچہ، مشترک رسم و رواج اور عقائد تھے۔ یہ سنسکرت زبان تھی جس نے بات چیت، ربط و تعلق اور ادبی کاوشوں کے لئے ایک مشترک وسیلے کا کام دیا۔ علاقائی زبانیں ترقی کے مختلف مدارج میں تھیں اور مختلف خطوں میں بولی جاتی تھیں لیکن سنسکرت سچ مچ پورے ملک کی زبان تھی۔ یہ کئی صدیوں تک ہندوستان کی قومی زبان بنی رہی۔ بلاشبہ ملک کے تہذیبی ارتقاء میں سنسکرت نے نمایاں کام کیا ہے۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ایک بار سنسکرت کو اس اونچے استھان پر بٹھانے کی کوشش کریں اور اسے بین الریاستی زبان بنا دیں حالانکہ میں اس سے باخبر ہوں کہ اس قسم کا مطالبہ بعض حلقوں سے کیا گیا ہے۔ یہ مطالبہ کس حد تک قابلِ عمل یا مناسب ہے، اس کے بارے میں کوئی رائے دئے بغیر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ آج کے اس بدلے ہوئے حالات میں بھی سنسکرت کے مطالعہ سے ہمیں بہت کچھ ملے گا جس سے مجموعی طور پر ملک کو کافی فائدہ پہونچے گا۔ رسمی طور پر ہم اس عظیم زبان کو جو مرتبہ چاہے دیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ یہ ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے جدید ہندوستان کی پھلتی پھولتی زبانیں سیراب ہو رہی ہیں۔

ایک علاقے کو دوسرے سے جُدا کرنے والی طویل مسافتیں، اور قسم قسم کے مقامی رسم ورِواج اور روایت کے باوجود شمالی ہندوستان کا کوئی آدمی یہ دیکھ کر خوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جنوبی ہندوستان کے لوگ بھی ان ہی عقائد اور مذہبی رسوم کو مانتے ہیں جو شمالی ہندوستان میں رائج ہیں۔

تامل ناڈ اور ہندی کا پرچار

یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں تامل نہیں جانتا اور کمبن کا لکھا ہُوا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتا لیکن اس زبان کو جاننے والوں کے ذریعے جو کچھ میں نے سُنا ہے اس سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس مہان کوی نے آپ کی زبان میں وہی کام کیا ہے جو تلسی داس نے شمال میں ہماری زبان میں کیا ہے۔ میں کمبن کا ذکر صرف تُلسی داس کی حیثیت سے کر سکتا ہوں کیونکہ میں تُلسی داس سے تو واقف ہوں لیکن کمبن سے نہیں۔ شمالی ہندوستان کے حالات سے واقف کوئی بھی شخص جانتا ہے کہ ہر گاؤں میں لوگ، جن میں زیادہ تر ان پڑھ ہوتے ہیں۔ تلسی داس کے شعروں کو دہراتے ہیں اور ہر رات سب لوگ مل جُل کر بڑے جوش کے ساتھ گھنٹوں گاتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہندستان کی قدیم روایات اور داستانیں اور قدیم فلسفہ عوام تک پہونچا ہے۔ لہٰذا میں اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ کسی طرح کمبن کی کویتا اُن عام لوگوں کی زندگیوں کو مُتاثر کر رہی ہوگی جنھوں نے سنسکرت نہیں پڑھی ہے اور جو والمیکی کی راماین یا ہندوستانی فلسفے کی کسی اور کتاب کی ایک سطر بھی نہیں پڑھ سکتے۔

کمبن ڈے کے موقع پر منعقد کی گئی تقریبات کا صدارتی خطبہ۔ ۱۹ار نومبر ۱۹۵۵ء۔

تُلسی داس گو رام کے بھگت ہیں لیکن شیو بھگتی میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں بلکہ ایک موقع پر تو انھوں نے کہا ہے کہ شیو کا بھگت بنے بغیر کوئی شخص رام کا سچا بھگت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کے لئے فلسفیانہ نظریوں اور عقیدوں کے اختلافات پس منظر میں چلے گئے ہیں اور شمالی ہندوستان میں رام اور شیو ایک ہو گئے ہیں۔ کمبن نے اپنا زیادہ تر مواد اسی ذریعے سے حاصل کیا ہوگا جس ذریعے سے تلسی داس نے حاصل کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی نہ صرف ایک انسان بلکہ فوق البشر یعنی وشنُو کے اوتار کی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ شاعری کے حُسن اور خوبیوں کے علاوہ تلسی داس کے ہر مصرعے سے بھگتی کا بے پناہ اظہار ہوتا ہے اور یہی چیز بنیادی طور پر عام آدمی کو مُتاثر کرتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہی بات کمبن پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ بھگت پہلے ہیں اور شاعر بعد میں۔

ہندوستان کی قومی زبان کے بارے میں وقتاً فوقتاً باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ تامل زبان بولنے والوں کے مجمع کے سامنے اس موضوع کو چھیڑتے ہوئے جو انھیں بے حد عزیز ہے میں ایک ہندی بولنے والے کی حیثیت سے، ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے جن کا تعلق ہندی کے پرچار سے بھی ہے یہ فوراً کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ شمالی ہندوستان یا جنوبی ہندوستان میں مقامی اور علاقائی زبانوں کی جگہ ہندی ٹھونس دیں اور اگر کوئی اتنا بے وقوف ہے کہ ایسی کوشش کرے تو اُسے جلدی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک ناممکن کام کو انجام دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں اور ہمارے ذہنوں میں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا ہے کہ ہم کسی کے اُوپر کوئی بھی چیز جبراً لاد دیں چہ جائیکہ زبان جو اس کے بولنے والوں کو بے حد عزیز ہوتی ہے۔

لہٰذا میں جنوب میں رہنے والوں سے گذارش کروں گا کہ وہ اس مسئلے کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ ہندوستان کے کسی اور زبان کے مقابلے میں سب سے زیادہ لوگ ہندی بولتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہندی کو کل ہند مقاصد کے لئے استعمال ہونے والی زبان کی حیثیت سے منظور کیا گیا ہے۔ یہ مقصد بالکل نہیں ہے کہ مقامی زبانوں کو کمزور بنایا جائے یا کسی طرح سے لوگوں کی توجہ ان کی اپنی زبانوں کی طرف سے ہٹادی جائے۔ لہٰذا میں مشورہ دوں گا کہ اس مسئلے پر بالکل عملی اور قومی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ آپ اُن حدود سے واقف ہیں جو نہ صرف دستور نے بلکہ عقل سلیم نے بھی عائد کر رکھی ہے۔ اور وہ حدود یہ ہیں کہ ہندی کو کُل ہند مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ ان کاموں کے لئے نہیں استعمال کیا جائے جو کسی خاص علاقے میں بولی جانے والی زبان کے ذریعے بخوبی یا غالباً زیادہ بہتر طور سے پورے ہو سکتے ہوں۔ آپ بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں ہم لوگوں کے لئے یہ سوچنا کتنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ہندی کو ایک زبان کی حیثیت سے اختیار کر لینے میں کوئی مخالفت ہوگی۔ جواب میں آپ یہ کہیں گے آپ کے لئے بھی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ بلا کسی اختلاف کے اسے کس طرح منظور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف قومی سہولت کی خاطر ایک خاص زبان اختیار کی گئی ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی دُوسری ایسی زبان ہوتی جسے ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی سمجھتی ہوتی تو مجھے پورا یقین ہے کہ کُل ہند مقاصد کے لئے وہی زبان چنی جاتی۔

یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ جو لوگ دوسری زبانیں بولتے ہیں ہندی اپنا لینے سے انھیں دقتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ میں فوراً کہوں گا کہ ایسی تمام احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ دوسروں کے مقابلے میں کوئی شخص نقصان میں نہ رہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں اور جس حد تک میں جانچ سکتا ہوں ایسی تدابیر اختیار کی جارہی ہیں اور کی جاتی رہیں گی تاکہ کوئی شخص محض ایک غیر ہندی داں شخص ہونے کی وجہ سے کسی طرح کا نقصان نہ اُٹھائے اور دوسروں کے مقابلے میں کسی طرح پیچھے نہ رہ جائے۔ پارلیامنٹ میں یہ یقین دہانی دی جا چکی ہے حالانکہ صدر جمہوریہ

کی حیثیت سے میرا کام یقین دلانا نہیں ہے یہ وزراء کے فرائض میں سے ہے کیونکہ وہی اس پر عمل درآمد بھی کراتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسے معاملے میں اختیار کے ساتھ کچھ کہہ سکتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وزراء کیا محسوس کرتے اور سوچتے ہیں لہذا میں بلا تامل یہ یقین دلاتا ہوں کہ کسی شخص پر کوئی زبان جبراً عائد کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ہندی کو کل ہند مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تو اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ ملک کی اکثریت کو ہر نقطۂ نظر سے اس میں سہولت ہوگی۔

زبان کے معیار کا سوال نہیں اٹھتا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانیں خاصی ترقی یافتہ ہیں اور انھیں تقریباً دو سو برسوں تک انتظامی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا گیا ہے اس لئے ان میں ایسے الفاظ موجود نہیں ہیں جو پورے ملک میں سمجھے جا سکیں۔ ایک ہندی بولنے والے شخص کی حیثیت سے میں نے تمام غیر ہندی دانوں سے کئی بار اپیل کی ہے کہ وہ ہندی کی شکل [illegible] متعین کرنے میں حصہ لیں اور ایسا بنا دیں کہ اس کے ذریعے جدید سے جدید خیالات اور مفاہیم ادا ہو جائیں۔ جب یہ قومی زبان یا پورے ملک کی زبان بن جائے تو یہ دوسری زبان بولنے والوں کا صرف حق ہی نہیں فرض بھی ہے کہ وہ اسے مالا مال بنانے میں حصہ لیں۔ اگر آپ ہندی کی کوئی کتاب پڑھیں تو آپ کو بہت سے عربی اور فارسی کے الفاظ ملیں گے کیونکہ ہندوستان کے مسلم دورِ حکومت میں عربی اور فارسی کا ہندی پر اثر پڑا ہے۔ آج کی ہندی میں آپ کو بنگلہ، مراٹھی، گجراتی حتیٰ کہ انگریزی کے اثرات بھی نظر آئیں گے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس پر تامل کے اثرات بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن دوسری زبانوں اور ہندی کے علم کی بنیاد پر بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہندی میں ہمیشہ دوسری زبان کی لفظوں کی کھپت کی گنجائش رہی ہے۔ ہندی دوسرے ذرائع سے جو کچھ لے سکتی ہے اسے حاصل کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ میں آپ کو اس زبان میں حصہ لینے کی دعوت دیتا ہوں تاکہ جس طرح میں اسے اپنی زبان کہتا ہوں آپ بھی کہہ سکیں۔

میں نے شمالی ہندوستان کے لوگوں سے اکثر کہا ہے کہ اگر کسی اور وجہ سے نہ ہی تو کم سے کم اسی خیال سے وہ جنوبی ہندوستان کی کوئی ایک بھاشا سیکھیں کہ جب تک وہ وہاں کی زبان کو نہیں جانیں گے اور اس کی کچھ اچھی کتابوں کو نہیں پڑھیں گے تو وہ وہاں کے لوگوں کے دلوں کو نہ چھو سکیں گے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ شمالی ہندوستان کے لوگ جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا مطالعہ کریں تاکہ وہ یہاں کے عوام کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اب تک سنسکرت نے یہ کام دیا تھا۔ اس نے وہ ایکتا اور ہم آہنگی پیدا کی تھی جو کسی اور دوسرے طریقے سے ممکن نہ تھی۔ یہی وہ وقت ہے جبکہ اس ایکتا اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا تاکہ ہم جو ایک قوم ہیں خوش حال بنیں، ترقی کریں اور زیادہ سے زیادہ استحکام حاصل کریں۔

آپ سے یہی اپیل اور گذارش کرکے میں کمبن کو بہترین طریقے سے خراج عقیدت پیش کرسکتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر کوئی ایسا آدمی جو اچھی ہندی جانتا ہو کمبن کی تصنیفوں کا ہندی میں ترجمہ کردے تو شمالی ہندوستان میں ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جو نہ صرف کمبن کی شاعری اور بھگتی کی تعریف کریں گے بلکہ تامل زبان کی عظمت کے بھی قائل ہو جائیں گے۔

قومی نقطۂ نظر کی ضرورت

تنگ نظری ہمارے درمیان کیا کچھ کرسکتی ہے اس کا پریشان کن اور تکلیف دہ مظاہرہ ہمیں حال ہی میں دیکھنے کو ملا۔ گاندھی جی کے ساتھ کام کرنے والے لوگ مشکل سے سوچ سکتے تھے کہ ریاستوں

یکم فروری ۱۹۵۷ء کو ترپونڈرم کارپوریشن کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ تقریر اس کا جواب ہے۔

کی سرحدوں میں معمولی ردّو بدل سے اتنا ہنگامہ اور خلفشار پیدا ہو جائے گا جیسا کہ ہم نے گذشتہ چند ہفتوں میں دیکھا ہے۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے کہ ملک میں تنگ نظری کا یہ مظاہرہ آخری مظاہرہ ہوگا۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے چاہے ہمارا تعلق کسی بھی شعبۂ زندگی سے ہو یا ہم کوئی بھی کام کرتے ہوں تاکہ ہم اتحاد و اتفاق کے جذبے کو پروان چڑھائیں اور معمولی معمولی باتوں میں اُلجھ کر اصل شے کو نہ بھول جائیں۔ کیونکہ اگر جنگل کو برباد کر دیا گیا تو درخت بھی باقی نہ رہیں گے۔ ملک ہی ریاستوں کو باقی اور قائم رکھ سکتا ہے اور کوئی ریاست خواہ وہ کتنی ہی اچھی، کتنی ہی مضبوط اور کتنی ہی متحد کیوں نہ ہو قائم نہیں رہ سکتی اگر ملک کا شیرازہ بکھر جائے۔ لہذا ہمیں اپنے خیالات، الفاظ اور افعال میں کافی ہوشیار اور محتاط ہونا چاہیئے۔

میں ملک کے دُور ترین جنوبی حصّے میں تقریر کر رہا ہوں اور میں شمالی ہند کے دُور ترین صوبے سے آیا ہوں لہذا میں پورے ملک کے لئے کچھ کہہ سکتا ہے۔ آپ کیپ (راس) کے پاس رہتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ یہ بھی یقین رکھیں کہ جو علاقے ہمالیہ کے دامن میں ہیں وہ آپ کے ہیں اور مجھے بھی آپ اس کی اجازت دیں کہ ہمالیہ کی ترائی میں رہنے والا میں بھی راس کماری کو اپنا سمجھوں۔ جب تک ہم میں اتحاد اور حبّ الوطنی کا یہ احساس نہ پیدا ہوگا اور جب تک کہ ہم مقامی اور فرقہ وارانہ احساسات، ذات پرستی اور متعصّبانہ جذبات کو ملک کے مجموعی مفاد کی خاطر پس پشت نہ ڈالیں گے اس کا امکان ہے کہ ہم اپنی آزادی کھو دیں اور ہماری جمہوریت عارضی ثابت ہو۔ حالیہ واقعات نے ہمیں چیتا وُنی دی ہے۔ ہمیں ان پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ مجھے اُمید ہے کہ ملک کے لوگ ہمت اور جرأت سے کام لیں گے اور حالات پر قابو پالیں گے اور ملک میں جمہوریت کی جو نیو ڈالی گئی ہے وہ مضبوط ثابت ہوگی۔ حالیہ مہینوں میں فتنہ و فساد کے جو مظاہرے ہوئے ہیں وہ سمندر کی لہروں کا جھاگ

ثابت ہوں گے جو سمندر کی تہ تک۔ کبھی نہیں پہونچتے۔ جھاگ کی طرح ان میں بھی کثافت تھی اور ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے کہ یہ جلد ہی غائب ہو جائیں گے۔ اس ملک کو اس کے عظیم الشان ماضی کے شایاں شان اور مستقبل تابناک بنانے میں ہم تمام لوگوں کو اپنی صلاحیت بھر حصہ لینا چاہیئے۔

پنجابی زبان

یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ دوسری ہندوستانی زبانوں کی طرح پنجابی بھی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور اس کا ادب مالا مال ہو رہا ہے۔ یہ تمام زبانیں ایک خاندان کے فرد کی طرح ہیں جنھیں ہم مجموعی طور پر ہندوستانی ادب کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر زبان اہم ہے اور ان میں سے ہر ایک ہندوستانی ادب کو مالا مال کرنے اور اسے عظمت و افتخار بخشنے میں معاون ہے۔ ہر زبان کی اپنی خصوصیتیں ہیں، اور اس کا اپنا ادب ہے۔ ان کا آپسی تعلق اتنا گہرا اور مضبوط ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے آغاز و ارتقاء کو دوسری زبانوں کے آغاز و ارتقاء پر غور کئے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔

ہندوستانی ادب کا دھارا برابر بہتا رہا ہے اور ماقبل تاریخ کے زمانے سے ہی یہ ہم آہنگی کے آدرش اور اظہار خیال کی آزادی کا عکاس رہا ہے۔ ویدوں کے زمانے کے بعد جب تاریخی دور شروع ہوتا ہے اور ہمیں کچھ حد تک ادبی ارتقاء کے عمل کا پتہ چلتا ہے تو اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کی ادبی کاوشوں کا واحد ذریعہ سنسکرت تھی۔ کچھ دنوں بعد پالی اور پراکرت بھی ادبی تصنیفوں میں سنسکرت کی متبادل زبان کی حیثیت سے استعمال ہونے لگیں اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ ترقی کرنے لگیں۔ دور متوسط میں ان تینوں زبانوں سے دوسری زبانوں کے انکور پھوٹے۔ یہی وہ وقت تھا جب جدید ہندوستانی زبانوں کے خد و خال متعین ہو رہے تھے۔

[illegible] ۱۸ اپریل ۱۹۶۰ [illegible] کو دوسری [illegible] ہند پنجابی کانفرنس کے موقع پر تقریر۔

یہ تمام زبانیں، جن کا تعلق ہند آریائی گروپ سے ہے، اپنی مخصوص صلاحیتوں اور مقامی ماحول کے تحت ترقی کرتی رہیں۔ ان تمام زبانوں کا ماخذ بشمول پنجابی واضح طور پر ایک ہے۔ ان کے الفاظ کا خزانہ بھی زیادہ تر ایک ہی ذریعہ سے حاصل ہوا ہے۔ اور جن چیزوں نے ان میں تخلیقی تحریک پیدا کی ہے جیسے ہندوستانی کلچر، فکر و فلسفہ اور تاریخی پس منظر وہ بھی مشترک ہیں۔ دوسری طرف جنوبی ہندوستان کی زبانیں جن کا تعلق ڈراویڈی گروپ سے ہے سوائے تامل کے اسی وقت بڑھنا شروع ہوئیں۔ تامل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دور متوسط سے بہت پہلے اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔

جب ہم اس زاویہ سے اس مسئلے پر نظر ڈالیں تو اس بات پر متفق ہوں گے کہ ہمارے ملک میں نہ صرف خیالات بلکہ زبان کی بھی مکمل آزادی تھی۔ مختلف ریاستوں میں مختلف اسباب کی بنا پر اختلافات یا جھگڑے بھی ہوتے ہوں گے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں زبان بھی ان میں ایک وجہ نہ تھی۔ سیاسی خلفشار اور مختلف سلطنتوں کے عروج و زوال کے درمیان ہماری زبانیں اپنی صلاحیتوں کے مطابق اور اس اتھل پتھل سے کسی طرح کی کوئی رکاوٹ محسوس کئے بغیر آگے بڑھتی رہیں۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ اس بات کا بھی کافی ثبوت ہے کہ ان زبانوں میں آپس میں لین دین بھی ہمیشہ سے ہوتا رہا۔ ہمارے یہاں بہت سے ایسے شاعر ہیں جن پر ایک سے زیادہ زبان والے دعویٰ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ودیاپتی کو ہندی اور بنگلہ والے دونوں اپنا کہتے ہیں۔ اسی طرح میرا بر ہندی اور گجراتی دونوں زبانیں دعویٰ کرتی ہیں۔ ایسے شاعروں کی تعداد تو ایک درجن سے زیادہ ہے جو پنجابی اور ہندی دونوں میں مشترک ہیں۔ پنجابی زبان کی بنیاد ڈالنے اور ترقی دینے والے قابل احترام گروؤں اور ان کے پیروؤں کو ہندی ادب میں باعزت جگہیں دی گئی ہیں۔ ہندی اور پنجابی کا مضبوط اور گہرا سمبندھ آج بھی ان کی متعلقہ تاریخوں اور مشترک الفاظ کی کثرت سے ظاہر ہے۔

آزاد ہندوستان میں ہندی کی حیثیت میں کچھ تبدیلی آئی ہے اور یہ رفتہ رفتہ کل ہند زبان

بنتی جارہی ہے کیونکہ آگے چل کر اسے انگریزی کی جگہ لینا ہے۔ حالانکہ ہندی اور پنجابی بہنوں کی طرح ہیں لیکن دونوں کے حلقے الگ الگ ہیں۔ کسی دُوسری ہندوستانی زبان کی طرح پنجابی کا ادبی خزانہ بھی ہماری مشترک قومی میراث کا ایک حصّہ ہے۔ میں پنجابی زبان و ادب سے زیادہ واقف نہیں ہوں لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے میلانات اور روایات صحت مند ہیں اور ہماری تہذیب و قومی امنگوں کے عین مطابق ہیں۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے جس میں بہت سے مذہبوں کو ماننے والے اور مختلف زبان بولنے والے لوگ رہتے ہیں۔ مختلف لسانی گروپوں کو اپنی متعلقہ زبان اور ادب کو مکمّل آزادی کی فضا میں ترقّی دینے کا یہاں پُورا پُورا موقع موجود ہے۔ مجھے اُمید رکھنی چاہیئے کہ تمام ہندوستانی زبانیں ترقّی کرتی رہیں گی اور ہمارے ملک کی موجودہ حالت اور ناخواندگی کا خاتمہ کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں گی۔

بھارتی ایکتا

ریاستوں کی تنظیم نو کے سوال پر جو شدید اختلافات دیکھنے میں آئے تھے اُنھیں مدِّنظر رکھتے ہوئے ہمیں اتحاد و اتّفاق کے جذبے پر جو ملک کے ایک حصّے سے لے کر دُوسرے حصّے میں موجود ہے دوبارہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہماری ایکتا کوئی قدرتی چیز ہے اور اس کے بارے میں سوچنے یا اس کا خیال رکھنے کی ضرورت نہیں یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ ہر قسم کی کھینچ تان اور دباؤ بھی برداشت کرنے کی اہل ہے۔ حقیقت یہ ہے

۱۶ر اگست ۱۹۵۶ء کو مدراس میں جلسۂ عام سے خطاب۔

کہ ہماری ایکتا گو کہ بہت پرانی ہے اور اس کی جڑیں بھی گہری ہیں لیکن کم سے کم اس وقت اسے پروان چڑھانے اور مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا تہذیبی اتحاد صدیوں پرانا ہے لیکن اس کی وجہ سے ہم سیاسی طور پر متحد ہونے میں ناکام رہے اور ان گنت مرتبہ بیرونی حملہ آوروں سے شکست کھا گئے۔ خوش قسمتی سے اب ہم سیاسی طور پر بھی متحد ہیں۔ ان حالات میں ہمارے لئے تہذیبی اور سیاسی ایکتا کو برقرار رکھنا اور مضبوط بنانا آسان ہوگا۔ لیکن کبھی کبھی سیاست تباہیاں بھی لاتی ہے اور اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

لہٰذا ہمیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ سیاسی اتحاد ہماری توجہ کا محتاج نہیں ہے۔ آپ ذرا سوچیں کہ اگر یہ سیاسی اتحاد برقرار نہ رہے تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ موجودہ صورت میں ہندوستان دُنیا کی دُوسری بڑی قوم ہے۔ چین کے علاوہ کسی دُوسرے ملک کی آبادی اتنی زیادہ نہیں ہے اور نہ ہی ایک دستور کے تحت اور وزراء کی ایک جماعت کے ذریعے حکومت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں الیکشن کی کوئی ایسی دُوسری مثال نہیں مل سکتی جس میں لگ بھگ ۱۸ کروڑ آدمیوں کو ووٹ دینے کا حق ہو۔ آئندہ چند مہینوں میں دوسرا عام چناؤ ہوگا۔ اس زمانے میں کسی اور چیز کے مقابلے میں تعداد کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ ہندوستان جس کی آبادی ۳۶ کروڑ سے زیادہ ہے۔ آج کی دُنیا میں بڑا نمایاں حصہ لے سکتا ہے۔ لیکن ذرا سوچئے تو اگر ہم ایک دُوسرے سے پھر الگ الگ ہو جائیں اور ایک ہندوستان کے بجائے کئی آزاد ریاستیں وجُود میں آجائیں تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔ یہ ضروری ہے کہ آج ہم ۳۶ کروڑ انسان متحد ہو کر بالکل ایک بن جائیں۔ اتحاد کا مطلب ہے رنگ یکسانیت نہیں ہے۔ ہماری قوم کی ایک ممتاز خصوصیت کثرت میں وحدت ہے۔ یہاں کی عورتیں قیمتی پتھر جڑے ہوئے زیورات پہنتی ہیں۔ ہر چھوٹا نگینہ جو اس میں جڑا ہے اس کی اپنی قدر و قیمت ہے اور اپنا مقام ہے تاہم پورا زیور الگ الگ

پتھروں سے بالکل مختلف ہے۔ مجموعی طور سے یہ زیور نہ صرف قیمتی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ ہندوستان اپنی تمام رنگا رنگیوں کے ساتھ اسی جڑاؤ زیور کی طرح ہے۔ ہمیں کوئی نگینہ توڑنا نہیں چاہیئے کیونکہ یہ مکمل زیور کا ایک حصہ ہے۔ ہر پتھر کو اپنی تمام رعنائی، شان و شوکت اور حسن کے ساتھ اپنے مقام پر برقرار رکھنا چاہیئے تبھی اسی زیور کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرے گی۔

نامناسب حریفانہ کوششوں کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ہمیں اشتراک و اتحاد اور دوستانہ جذبے کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ کبھی کبھار اختلافات ہوں گے اور ان سے بچا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن ان کو مناسب حدود کے اندر رکھنا چاہیئے۔ اور اس کی اجازت نہیں دینی چاہیئے کہ یہ ملک کے بنیادی اتحاد کو ہی تباہ کر دیں۔ مہاتما گاندھی ہم سے کہا کرتے تھے "ہمیشہ دینے کے لئے تیار رہو۔ لینے کے لئے نہیں۔" یہ بات نہ صرف افراد بلکہ گروہوں اور فرقوں کے لئے بھی صحیح ہے۔ اگر ہر گروہ دوسرے کے بارے میں سوچے تو ایسا کوئی گروہ نہیں رہ جائے گا جسے نظر انداز کیا گیا ہو۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم دوسروں کے بجائے اپنے خاص گروہ کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ گروپ اکیلا اپنے مفاد کا ذمہ دار رہ جاتا ہے اور کوئی دوسرا اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اگر ہر گروپ اپنے بجائے دوسروں کے بارے میں سوچے تو ہر گروہ کا تمام دوسرے خیال رکھیں گے اور اسے خود اپنے مفاد کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس سے بڑا فرق پیدا ہو گا۔ لہٰذا ملک کی بہتری کی خاطر یہ ضروری ہے کہ ہم پوری قوم کے بارے میں سوچیں اور اس کے اندر جو چھوٹے چھوٹے گروہ ہیں ان میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔ موجودہ حالات میں تو اور بھی ضروری ہے جبکہ بعض قابل افسوس واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ میں اُمید رکھتا ہوں کہ یہ واقعات بالکل عارضی ثابت ہوں گے۔

خوش قسمتی سے آپ کے یہاں ایسے واقعات نہیں ہوئے اور مجھے امید ہے کہ مستقبل میں بھی نہیں ہوں گے۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ آپ پورے ملک کے لئے سوچیں گے کیونکہ آپ اس کے ایک کونے میں ہی ہیں حالانکہ یہ بہت بڑا گوشہ ہے۔ اگر آپ اس کونے سے ملک کے نقشے پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ یا تو آپ بالکل اوپر ہیں یا بالکل نیچے۔ چاہے آپ جس حالت میں ہوں آپ کی ذمہ داری بڑی بھاری ہے۔ اگر آپ سب سے نیچے ہیں تو گویا آپ کی حالت پیروں جیسی ہے جسے پورے جسم کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر آپ سب سے اوپر ہیں تو آپ سر ہیں جو بوجھ اٹھانے میں شریک رہتا ہے۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ آپ کبھی ملک کو نہیں بھولیں گے اور نہ ہی اس کے مفاد کو نظر انداز کریں گے۔

عالمی معاملات میں ہم ایک نئی جگہ حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے وزیر اعظم عالمی امن کو برقرار رکھنے میں تن من سے لگے ہوئے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کتنی طاقت، زور اور اختیار کے ساتھ اپنے اس مشن کو آگے بڑھا سکتے ہیں اگر انہیں یقین ہو جائے کہ ان کے اپنے ملک میں کوئی گڑبڑی نہیں ہے۔

اس وقت ہم دوسرے پلان کو سرانجام دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ پہلا پلان اس سے زیادہ کامیاب ہوا جتنا شروع میں ہم نے سمجھا تھا۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے کہ دوسرا پلان پہلے پلان سے کہیں زیادہ کامیاب ہوگا۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب پلان پر عمل کرنے میں تمام لوگ اشتراک و تعاون سے کام لیں اور اپنا کاندھا لگا دیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں توازن قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور آپ کو اس کا پورا یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ کسی خطے کے مفاد کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ لیکن ہمیں بعض علاقوں یا ضرورتوں کو ترجیح دینی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ جب ہم مندر میں بھی جاتے ہیں تو ہر آدمی بیک وقت درشن نہیں کر سکتا۔ ایک کے بعد دوسرا آدمی جا سکتا ہے۔ اسی طرح جب ہم کسی ندی میں اشنان کرنے جاتے ہیں تو تمام لوگوں کا ایک ساتھ اشنان کرنا ہمیشہ

ممکن نہیں ہوتا۔ قطار میں کھڑے رہنے اور اپنی باری کا انتظار کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ ایسے اقدامات کئے جارہے ہیں جس سے ہر آدمی کو موقع ملے۔ جب تک کہ ایسا نہ ہوگا مواقع کی یکسانیت کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح پنج سالہ پلانوں میں ہر آدمی کا خیال رکھا جائے گا لیکن ظاہر ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام لوگوں کی ضرورتیں نہیں پوری کی جاسکتیں۔ اور آپ کو یقین رکھنا چاہیئے کہ انجام کار کوئی بھی نظر انداز نہیں ہوگا۔

ہندی کو اپنے دروازے کھُلے رکھنے چاہئیں

اس ریاست میں راشٹر بھاشا کے پرچار کا کام گذشتہ بارہ برسوں سے ہورہا ہے۔ آپ کو بتایا جاچکا ہے کہ اس سلسلے میں کیا کیا کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ آزادی کے بعد سے محسوس کیا گیا ہے کہ اس کام کو جس قدر جلد ممکن ہو کیا جائے تاکہ ہندی ریاستوں کے آپسی رابطے اور مختلف میدانوں میں کاروبار کرنے کے لئے اختیار کی جاسکے۔

اس سلسلے میں ہمیں چند باتیں یاد رکھنی چاہئیں تاکہ ہم ایسی غلط فہمیوں سے بچ جائیں جو مشکلات یا کم سے کم نفسیاتی مشکلات پیدا کرتی ہیں۔ ہندی بولنے والوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ کسی علاقائی زبان کی جگہ پر یا اُسے کسی طرح سے نقصان پہونچا کر ہندی کا پرچار نہ کیا جائے۔ یہ تمام زبانیں نہ صرف متعلقہ علاقوں میں استعمال ہوتی رہیں گی بلکہ ان کو ترقی دینے اور

۱۳ ستمبر ۱۹۵۶ء کو راشٹر بھاشا پرچار سمتی کا بنیادی پتھر رکھنے کی تقریب کے موقع پر تقریر۔

انھیں مالا مال کرنے کے لئے منصوبہ بنایا جائے گا اور اس کام میں ہر طبقے کو ہر ممکن مدد دینی چاہیئے۔ اگر اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان علاقوں میں جہاں ہندی نہیں بولی جاتی ہے ہندی کے پرچار سے اعتماد اور عوام کی دلچسپی کی بجائے مخالفت پیدا ہوگی۔ اس لئے ہندی کی ہمت افزائی کرتے وقت ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جو علاقائی زبانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ اور یہ بات بالکل واضح طور پر سمجھا دی جائے کہ ان علاقوں میں ہندی صرف مختلف ریاستوں میں مراسلت اور رابطے کے لئے استعمال ہوگی۔ بعض اوقات ہندی ہمیں علاقائی زبانوں کی حیثیت سے نظر آتی ہے حالانکہ ان کی اصل حریف انگریزی ہے نہ کہ ہندی۔

ہم لوگ جانتے ہیں کہ تمام ریاستوں میں یونیورسٹیاں قائم ہو رہی ہیں اور یہ مقامی زبانوں کی ہمت افزائی کرتی ہیں۔ ان زبانوں کو پروان چڑھانا اور باضابطہ ترقی دینا اور ان کے ادب کو مالا مال کرنا یونیورسٹیوں کا اولین فرض ہے۔ ان میں سے بعض یونیورسٹیاں علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کر چکی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ جن یونیورسٹیوں نے اب تک ایسا نہیں کیا ہے وہ جلد یا بدیر علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ضرور اختیار کر لیں گی۔ لہذا یہ سوچنا غلطی ہے کہ یونیورسٹیوں میں جب انگریزی ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گی تو اس کی جگہ لازمی طور پر ہندی ہی لے گی۔ آپ کی اپنی ریاست ایک دو بھاشائی پردیش ہے اور یہاں ہندی اور مراٹھی کو یونیورسٹی کے ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے منظور کیا گیا ہے اور سرکاری دفتروں نیز یونیورسٹیوں میں زیادہ سے زیادہ ان ہی سے کام لیا جا رہا ہے۔ اگر مدھیہ پردیش ریاست کا یہ حصہ کسی دوسری ریاست میں شامل ہو جائے تو بھی یہ رجحان بڑھتا ہی جائے گا۔ حتیٰ کہ وہاں بھی مراٹھی اور گجراتی دو علاقائی زبانیں یونیورسٹی تعلیم کا ذریعہ بنے گی۔ گجرات اور پُونا کی یونیورسٹیوں نے تو انگریزی کی جگہ پر گجراتی اور مراٹھی کو اختیار بھی کر لیا ہے۔ ان یونیورسٹیوں نے اپنی متعلقہ

زبانوں کو ترقی دینا اور مالا مال کرنا اپنے خاص فرائض میں شامل کر لیا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں مراٹھی بولی جاتی ہے وہاں انگریزی کی جگہ مراٹھی لے گی جس طرح ہندی کے علاقوں میں ہندی یہ جگہ لے گی اور دکھنی بھارت میں یہاں کی چار زبانیں انگریزی کی جگہ رائج ہوں گی۔ لیکن کاروبار اور کُل ہند تعلّقات اور رابطے کے لئے انگریزی کی جگہ ہندی استعمال ہوگی۔ قومی زبان کا اس سے زیادہ وسیع مقاصد کے لئے استعمال ضروری ہے اور نہ میری رائے میں مناسب ہی ہے۔ اگر اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہے تو اس کو دُور کرنا ان لوگوں کا فرض ہے جو ہندی بولتے ہیں یا ہندی کے لئے کام کرتے ہیں۔

ایک دُوسری بات جو ہمیشہ ذہن میں رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں کی ہندسب ترقی اور ان کے ادبی خزانوں میں اضافہ ہیں ہماری اپنی ضرورت ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جبکہ میں نے یہاں ہندی ساہیتہ سمیلن کے اجلاس کی صدارت کی تھی تو میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ دُوسری زبانوں سے آئے ہوئے الفاظ کا بائیکاٹ ہندی کے حق میں مفید نہ ہوگا۔ ایسے الفاظ جو ہندی الاصل نہیں ہیں مگر ہندی میں چل پڑے ہیں انھیں نکالنا یا ہندی اور سنسکرت کے لفظوں سے بدلنا نہیں چاہیئے۔ میرا آج بھی یہی خیال ہے۔ میرا خیال ہے کہ دُوسری زبان کے ایسے الفاظ کے لئے ہندی کو اپنے دروازے کھلے رکھنے چاہئیں جو اس میں کھپ چُکے ہیں یا کھپ سکتے ہیں۔ انگریزی کی مثال لیجئے۔ اگر آپ انگریزی کی کوئی ڈکشنری لیں اور اس کی جدید ترین ایڈیشن کا کسی قدیم ایڈیشن سے مقابلہ کریں تو دیکھیں گے کہ اس زبان میں بہت سے نئے الفاظ کا اضافہ ہُوا ہے۔ کچھ دنوں پہلے مجھے ایک پُرانی ڈکشنری دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ یہ ڈکشنری اپنے حجم کے لحاظ سے نئے ایڈیشن کا دسواں حصہ بھی نہیں تھی حالانکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جدید ایڈیشن کا ٹائپ بھی چھوٹا ہو گیا ہے۔ یہ بات صرف نئے نئے الفاظ کے اضافے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب آکسفورڈ ڈکشنری مرتب کی جا رہی تھی تو بہت سے نئے الفاظ کا اضافہ کرنا پڑا اور جب کہ مرتبین ڈکشنری کے آخری حصّے کی ترتیب میں مصروف

۔۔۔ تو اتنے نئے الفاظ اور بڑھ گئے کہ انھیں شامل کرنے کے لئے ایک ضمیمہ شائع کرنا پڑا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی ایک زندہ اور ترقی پذیر زبان ہے اور اس سے اس کی ہمہ جہت ترقی کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ جیسا کہ حال میں ہمارے وزیر اعظم نے کہا ہے دُنیا کے ستر فی صدی سائنسی اور ٹکنیکل رسالے انگریزی میں شائع ہوتے ہیں ۔ اگر انگریزی کی حمایت کرنے والوں نے دُوسری زبانوں کے الفاظ کو بائیکاٹ کرنے کی پالیسی پر عمل کیا ہوتا اور انگریزی کو صرف ان الفاظ تک محدود رکھنے کا فیصلہ کیا ہوتا جن سے چاسر اور شکسپیئر باخبر تھے تو انگریزی نے اتنی حیرت انگیز ترقی نہیں کی ہوتی ۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو مالا مال کرنے میں دوسری زبانیں مدد دیں اور ہم ایسی امداد کو بخوشی قبول کریں گے ۔ میں چاہتا ہوں کہ دوسری زبانوں میں ہندی کے جو الفاظ ہیں اُن کے مختلف مطالب اور مفاہیم کا بغور مطالعہ کیا جائے ۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ ماہرین تعلیم اس مشورے کو منظور کریں گے لیکن انجام کار اُنھیں یہی کرنا ہوگا اور نہ صرف دوسری زبانوں کے الفاظ کو قبول کرنا ہوگا بلکہ ہندی گرامر کے سخت قاعدوں میں کچھ نرمی بھی لانی ہوگی ۔ اس وقت ہماری ۴۲ فی صدی آبادی ہندی بولتی ہے ۔ اگر بقیہ ۵۸ فی صدی کو ہندی سیکھنی ہے تو گرامر کے پُرانے اور سخت اصولوں سے انحراف کرنا ہوگا ۔ میں نے مراٹھی اور بنگلہ بولنے والے کی ہندی میں لکھی ہوئی کتابیں دیکھی ہیں ۔ یہ لوگ کسی لحاظ سے ہندی کے ماہر نہیں تھے البتہ اپنی زبان کے ماہر ضرور تھے ۔ یہ تصنیفیں ایک خاص طرز بیاں کی حامل تھیں ۔ طرز تحریر کی ان تبدیلیوں کو ہمیں پسند کرنا چاہیئے اور ہندی کا ایک حصّہ سمجھنا چاہیئے ۔ میرے خیال میں ہندی کو ترقی دینے اور مقبول بنانے کا یہی طریقہ ہے ۔

بعض اوقات ہم یہ بھی سُنتے ہیں کہ کچھ لوگ ہندی کو پسند نہیں کرتے ۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زیادہ وسیع پیمانے پر سمجھی جانے والی زبان ہے اور اس کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا ۔ شمالی ہندوستان اور دُوسری جگہوں کی ہندی انجمنوں کی طرح میرا تعلق

دکھن بھارت کے ہندی پرچار سمتی سے بھی ہے اور اس کے جلسوں میں میں نے اکثر حصہ لیا ہے۔ گذشتہ مہینے جب میں وہاں گیا تھا تو شری ایم ستینہ نارائن نے مجھے بتایا کہ دکھن میں جہاں تامل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبانیں بولی جاتی ہیں انگریزی جاننے والوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ اعداد انھوں نے مردم شماری کی حالیہ رپورٹ سے لئے تھے۔ اس کے برعکس ہندی جاننے والوں کی تعداد ۵۰ لاکھ سے کم نہیں تھی یعنی انگریزی بولنے والوں سے ۵ گنی زیادہ۔ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ دکھن کے لوگ ہندی نہیں جانتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ انگریزی کے اسکالر ہیں اور جو لوگ ہندی سیکھتے ہیں وہ ان بلندیوں تک نہیں پہونچتے۔ یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ فی الحال ہندی کا مطالعہ ضروری نہیں ہے۔ انگریزی اب تک اخباروں اور سرکاری دفتروں کی زبان ہے۔ اس سے یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندی پڑھنے والوں اور اس کے مختلف امتحان پاس کرنے والوں کی تعداد انگریزی جاننے والوں سے کم ہے۔ جو اعداد میں نے پیش کئے ہیں وہ واقعی حیرت انگیز ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب سرکاری زبان کے کمیشن کی رپورٹ شائع ہوگی اور زیادہ حقائق سامنے آئیں گے۔ بہرحال میں نہیں سمجھتا کہ ہندی کو اپنی قومی زبان بنانا کوئی بہت زیادہ مشکل کام ہے۔

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ آدمی ہندی اس لئے نہیں سیکھ رہے ہیں کہ اس کا پڑھنا لازمی نہیں ہے۔ چند سال پہلے مدراس میں یہ سوال اُٹھا تھا۔ حکومت نے ہندی کو لازمی قرار نہیں دیا تھا لیکن ہر اسکول میں ایک ہندی ٹیچر مقرر کر دیا تھا۔ اس انتظام سے بھی ۷۰، ۸۰ فی صدی طلبا مدراس میں ہندی پڑھ رہے ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ طلباء کی اتنی بڑی تعداد ہندی پڑھ رہی ہے جبکہ ہندی لازمی نہیں ہے۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہئے کہ ہندی کی اشاعت اور پرچار کا کام سارے ملک میں ترقی کرتا جائے گا۔ مہاراشٹر اور گجرات میں جہاں بہت بڑی تعداد ہندی سے واقف ہے یہ کام بالکل مشکل نہ ہوگا۔

مہاراشٹر میں جو لوگ ہندی نہیں جانتے وہ بھی اس کے مخالف نہیں ہیں۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی اپنی مادری زبان چھوڑ دے۔ بلکہ اس کے برعکس ملک میں بولی جانے والی تمام زبانوں کو بھرپور ترقی کے مواقع دینے چاہئیں اور ان کے ادبی خزانوں کو مالا مال کرنا چاہیئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں جہاں ہندی نہیں بولی جاتی وہاں ہندی صرف کُل ہند مقاصد اور مختلف ریاستوں میں تعلقات اور رابطے رکھنے کے لئے استعمال کی جائے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس سمت میں آپ کی کوششیں کامیابی سے ہم کنار ہوں گی۔

سنسکرت کی خاص جگہ

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ سنسکرت وشوا پریشد رفتہ رفتہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ منزل ہے سنسکرت زبان و ادب کو پورے ملک میں مقبول بنانا۔ یونیورسٹیوں میں طلباء کے درمیان سنسکرت ایک موضوع کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ یہ سیاسی اور سماجی حلقوں کا موضوع بحث بھی بن گئی ہے۔ غالباً اسی بیداری کی وجہ سے اور اس پریشد کی سرگرمیوں کے نتیجے کے طور پر حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا ہے جو ملک میں سنسکرت کے مطالعہ سے متعلق تمام مسائل کی چھان بین کرے گا۔ اُمید کی جاتی ہے کمیشن ان مسائل پر سنسکرت کی وسیع تر تشہیر اور افادے کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالے گا اور ایسی سفارشیں کرے گا جو نہ صرف سنسکرت زبان و ادب کو بلکہ قومی زندگی کو بھی مالا مال کر دیں گی۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہماری جنتا اور سرکار سنسکرت اور علاقائی زبانوں کے مطالعہ کی طرف زیادہ توجہ دے رہی ہے۔ جس طرح آج یہاں

سنسکرت وشوا پریشد (کورو کشیتر) میں افتتاحی تقریر۔ ۱۱ جنوری ۵۷ء ۱۹ء۔

کورو کھشیتر یونیورسٹی قائم کی گئی ہے اس طرح یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ بنارس میں ایک سنسکرت یونیورسٹی قائم کی جائے کیونکہ سنسکرت کی تعلیم سے بنارس کا تعلق زمانۂ قدیم سے رہا ہے۔

حالاں کہ پریشد کی کوششوں سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے نے سنسکرت کی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے لیکن ملک کے عوام کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں اسی حد تک یہ احساس پیدا ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس حد تک ممکن ہو ہم آج کی ضروریات کے مطابق سنسکرت کی تعلیم و تدریس کو آسان بنانے کی کوشش کریں۔ قدیم ادب کا مطالعہ بلاشبہ نہایت اہمیت رکھتا ہے لیکن آج کا طالب علم محض اس بات سے مطمئن نہ ہوگا۔ وہ ایسے ادب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے جو اسے اس زندگی کے قریب لے آئے جو وہ گذارتا ہے اور جو اس میں ایسی صلاحتیں بیدار کر دیں جو اس زندگی کے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنے کے قابل بنا دے۔

جہاں تک مطالعہ کے لحاظ سے سنسکرت کے ایک اہم موضوع ہونے کا سوال ہے سارے ملک میں اس کی اچھی نشانیاں نظر آ رہی ہیں۔ سنسکرت' ہندوستان میں بولی جانے والی کسی زبان پر غاصبانہ طور پر قابض ہونا نہیں چاہتی۔ ہماری تہذیبی اور مذہبی زندگی میں سنسکرت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اگر میں نے یہ بھی کہہ دیا ہوتا کہ سنسکرت کو ہماری سیاسی زندگی میں نہایت اہم جگہ حاصل ہے تو غلط نہ ہوتا کیوں کہ ہزاروں برس تک اس نے اس عظیم ملک کے مختلف حصوں کو ایک لڑی میں پروئے رکھا۔ حالاں کہ وقت گذرنے کے ساتھ سنسکرت کو ہمارے نصاب تعلیم میں یہ ممتاز جگہ حاصل نہ رہی لیکن اب بھی ہماری سماجی' مذہبی اور تہذیبی زندگی میں اسے بلند ترین مقام حاصل ہے۔ لہذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایکتا کے بندھنوں کو مضبوط بنانے کے ایک وسیلے کی حیثیت سے آج بھی سنسکرت کی اہمیت بالکل ختم نہیں ہو گئی ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ سنسکرت کو ہماری زندگیوں میں ایک بار پھر وہی مقام حاصل ہو جائے گا جس کی یہ مستحق ہے۔

ایک رسم الخط کا مسئلہ

میں اِس معذرت کے ساتھ اپنی تقریر شروع کروں گا کہ میں تیلگو میں آپ سے خطاب نہیں کرسکتا۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ہندوستان کی اتنی زبانیں سیکھیں جتنی سیکھنی ممکن ہو۔ مگر یہ فیصلہ میری زندگی میں اس وقت ہوا ہے جب میں کوئی نئی زبان سیکھنے کے لئے کافی بوڑھا ہو چکا ہوں۔ مجھے اس کے لئے بھی معذرت کرنی چاہئیے کہ میں ہندی میں بھی تقریر نہیں کر رہا ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ حاضرین میں ایسے لوگ ہوں گے جو ہندی نہیں سمجھتے۔ لہٰذا ایک بدیشی زبان بولنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین اور اُمید ہے کہ ایسا وقت جلد ہی آجائے گا جب ایک ہندوستانی کو دُوسرے ہندوستانی کو مخاطب کرنے کے لئے غیر ملکی زبان استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہی گاندھی جی کا منشا تھا جب کہ انھوں نے ملک کے دکھنی حصے میں ہندی کا پرچار شروع کیا تھا۔ جب ملک کے لئے دستور بنانے کا وقت آیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ ہم اپنے کام غیر معین عرصے تک ایک غیر ملکی زبان میں کرتے نہیں رہ سکتے۔ اس وجہ سے دستور بنانے والوں نے ہندی کو کُل ہند مقاصد کے لئے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ محسوس کیا گیا اور دستور میں لکھ بھی دیا گیا کہ صوبائی زبانوں کی بھی ہمت افزائی کی جائے گی اور ہر طرح کی سہولتیں دی جائیں گی تاکہ وہ ہر شعبہ زندگی میں پھلے پھولیں اور پروان چڑھیں۔ اس لئے حکومت ہند نے ایک نیشنل لٹریری اکیڈمی قائم کی ہے۔ اس اکیڈمی کا مقصد کسی زبان کو کسی خاص علاقے میں ترقی نہیں دینا ہے بلکہ تمام زبانوں کو ترقی دینا اور ایک مشترک پلیٹ فارم پر سبھوں کو جمع کرنا ہے تاکہ ان کی بہترین تخلیقوں کا ایک دُوسرے سے تبادلہ ہو۔ ملک

آندھرا ساہتیہ اکاڈمی حیدر آباد کے افتتاح کے موقع پر تقریر۔ ۷ راگست ۱۹۵۵ء۔

کی تمام زبانوں اور غیر ملکی زبانوں کے کلاسیکی ادب کے ترجمے کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ ہر زبان کے بہترین ادیبوں کو انعام دینے کی بھی تجویز ہے۔ ساہیتہ اکیڈمی کی صورت میں ایک کُل ہند ادارہ تین سال پہلے قائم ہو چکا ہے۔ تب سے کچھ ریاستوں میں مختلف زبانوں کے لئے اکیڈمی قائم ہو چکی ہے۔ آپ نے پہلے اکیڈمی قائم نہیں کی اس کی بڑی معقول وجہ تھی کیوں کہ آپ انتظار کر رہے تھے کہ وشال آندھرا کا خواب پورا ہو جائے۔

یہ اس بات کی وضاحت کا ایک مناسب موقع ہے کہ ہندی کو ملک کے کسی حصے پر مسلط کرنے کی خواہش کسی کی بھی نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم آپس میں اپنے خیالات کا اظہار خصوصاً کُل ہند مقاصد کے لئے ایک ہندوستانی زبان میں کریں خواہ یہ سیاسی مسائل سے متعلق ہو یا انتظامی مسائل سے یا تجارت اور کاروبار سے۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں ایک ایسی ہی زبان قومی زبان کی حیثیت سے اختیار کی جا سکتی تھی جسے ملک کے زیادہ لوگ سمجھتے ہوں۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ ہندی ایسی زبان ثابت ہوئی جسے ملک کے زیادہ سے زیادہ لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں اور اسی لئے اسے سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کیا گیا۔ ملک کی زبان کی حیثیت سے ہندی کو اختیار کرنے میں دستور بنانے والوں نے صرف تعداد کو مدنظر رکھا ہے اور ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی وجہ نہ تھی۔ تاہم ملک کے کچھ حصوں میں ایسے لوگ ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندی ان پر جبراً عائد کی جا رہی ہے لیکن میں اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ بیس سال پہلے بھی جب میں نے صدر کانگریس کی حیثیت سے ملک کے اس حصے کا دورہ کیا تھا اور بہت سے جلسوں میں تقریریں کی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ زیادہ تر جگہوں پر لوگوں نے انگریزی کے بجائے ہندی میں تقریر کرنے کی خواہش کی تھی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی۔

سامعین کی اکثریت نہ انگریزی سمجھتی تھی اور نہ ہندی اور انھیں میری تقریر کے ترجمے کا

انتظار کرنا پڑتا تھا۔ انگریزی سمجھنے والوں کی تعداد بھی غالباً اتنی ہی تھی جتنی ہندی سمجھنے والوں کی تھی۔ لہٰذا اگر انھیں میری تقریر کا ترجمہ ہی سننا تھا تو ان کے لئے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا کہ میری تقریر ہندی میں ہو یا انگریزی میں ہو۔ لیکن ہندی چونکہ قومی زبان تھی اس لئے وہ ہندی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ مجھے ہندی سے آپ کے لگاؤ اور اس قومی مقصد میں حصّہ لینے کے لئے آپ کے جوش وخروش کا احساس ہوا۔ یہی زبان بعد میں قومی زبان کی حیثیت سے اختیار کی گئی۔ تبھی سے میں آپ کے بارے میں نہایت اچھی رائے رکھتا ہوں۔

ہندوستان جیسے بڑے ملک میں اگر بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ یورپ میں بھی بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں سے بعض زبان بولنے والوں کی تعداد اُن سے کہیں کم ہے جو ہندوستان کی کوئی بھی زبان بولتے ہیں۔ اس کے باوجود یورپ کے لوگوں نے ان زبانوں کو باقی رکھا ہے۔ یہ ہمارے آبا و اجداد کی عقل مندی اور دُور اندیشی تھی کہ زبانوں کے اختلاف کے باوجود انھوں نے ملک کو ایک بنائے رکھا۔ انھوں نے ایسے طریقے نکالے جس سے ہم متّحد رہیں اور ہر قسم کی مشکلوں اور مصیبتوں کو جن کو کوئی دوسری قوم جھیل نہ سکتی تھی جھیل گئے اور آج بھی ایک قوم اور ایک ملک کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ اب جبکہ ہم نے سیاسی آزادی بھی حاصل کر لی ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسا عمل کریں اور اپنے معاملات کو اس طرح چلائیں کہ جو آزادی ہم نے حاصل کی ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے اور اس وسیع برادری کے ہر طبقے کو، خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتا ہو اس کے رسم و رواج اور رہن سہن کا طریقہ جیسا بھی ہو، ممکن حد تک ترقّی کرنے کی پوری پوری سہولتیں اور مواقع میسّر ہوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ ہم اس اتحاد اور ایکتا کو اور مضبوط کس طرح بنا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں میرا کچھ تجربہ ہے جس میں آپ کو شریک کرنا چاہتا ہوں۔ بہت سال پہلے ایک رسالہ دیوناگری میں چھپتا تھا جسے کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک جج شرو چرن نکالتے تھے۔ دیوناگری میں ہندوستان کے مختلف زبانوں کے مضامین ہوتے تھے مگر سب دیوناگری رسم الخط میں چھپتے تھے۔ میں نے

دیکھا کہ دیوناگری لپی میں ہونے کی وجہ سے ہم دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ سمجھ لیتے ہیں۔ تبھی سے میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر صوبائی زبانیں ایک رسم الخط میں لکھی جائیں تو وہ زیادہ بہتر طور پڑھی اور سمجھی جا سکتی ہیں۔ خوش قسمتی سے تامل کے سوا تمام زبانوں کے حروف تہجی ایک ہیں۔ یہ صورت حال صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر ہے مثلاً لنکا، برما، اور تھائی لینڈ کے حروف تہجی بھی ہمارے جیسے ہیں۔ رسم الخط مختلف ہے آواز ایک ہی جیسی ہے۔ ہم اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اگر ہم ایک ایسا رسم الخط اپنا سکیں جو سبھوں کو منظور ہو تو ایک زبان بولنے والوں کے لئے دوسری زبانیں بولنے والوں کو سمجھنا آسان ہو گا۔ جس دن اس خیال نے عملی جامہ پہنا یقیناً وہ بڑا مہان اور مبارک دن ہو گا۔

جس رسالے کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے وہ کوئی چالیس سال پہلے نکلتا تھا۔ چار پانچ سال پہلے جب نئی پارلیامنٹ کے ممبران مجھ سے ملے تو میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اس رسالے کو شائع کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے میرے مشورے کو قبول کیا اور دیوناگر کی دوبارہ اشاعت شروع ہو گئی۔ شری شردچرن کے دیوناگر میں مختلف زبانوں کے مضامین ہوتے ہیں مگر وہ دیوناگری لپی میں ہوتے تھے۔ لیکن موجودہ دیوناگر میں مختلف زبانوں کے مضامین ان کے ترجمے کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ہندی آرٹیکل کا تامل، تامل کا تیلگو، تیلگو کا گجراتی اور بنگلہ کا مراٹھی الغرض اسی طرح ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن سبھوں کو دیوناگری لپی میں بھی چھاپا جاتا ہے۔ میں اس خیال کو عالموں کے اجتماع کے سامنے پیش کر رہا ہوں کیونکہ یہ ان کے غور کرنے کے قابل ہے۔ میرے خیال میں ہم اپنے مختلف ادبی خزانوں کو زیادہ مالا مال کر سکیں گے اگر رسم الخط کی رکاوٹ راہ میں حائل نہ ہو۔ اس سلسلے میں دیوناگری کا نام لیا جا رہا ہے کیوں کہ سنسکرت ہمیشہ دیوناگری لپی میں لکھی گئی اور اسی وجہ سے سارے ملک میں لوگ اس لپی سے واقف ہیں لیکن میں اس پر زور نہیں دیتا۔ آپ کوئی بھی ایسی لپی اختیار کر لیں جو قابلِ عمل ہو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ پورے ملک کے لئے ہم ایک لپی کو اپنا لیں تاکہ ایک زبان بولنے والے کے لئے

دوسری زبان کا پڑھنا آسان ہو جائے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ۔ میں نے یہ مشورہ ایک ایسے فرد کی حیثیت سے دیا ہے جو ملک کی ایکتا میں دل چسپی رکھتا ہے ۔ اس کے پیچھے کوئی اختیار یا حکم نہیں ہے ۔

نوجوان اور رواداری کا جذبہ

ہندوستان ایک قدیم ملک ہے ۔ اپنی ہزاروں سال کی تاریخ کے دوران میں اس نے بڑی بڑی سلطنتوں کا عروج و زوال دیکھا ہے ۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے جغرافیائی حدود کو سکڑتے اور پھیلتے بھی دیکھا ہے ۔ اس نشیب و فراز کے باوجود خدا کے فضل سے ہندوستان اب تک ایک زندہ اور جاندار ملک ہے جبکہ بہت سے پرانے ملکوں کا وجود کتابوں کے سوا اور کہیں نہیں ہے ۔ ہم غالباً اس وجہ سے فنا نہ ہو سکے کہ ہمارے روایتی فکر و فلسفہ کے اندر کچھ بنیادی استحکام تھا جو ان تمام انقلابی تبدیلیوں کے درمیان ملک کو ایک مشترک ڈور اور بندھن سے باندھے رہا یہ ڈور اور بندھن وسیع النظری اور رواداری تھا ۔ اس طرح ہمارا نظام تفکّر نئے خیالات کو جذب کرنے اور نئی قدروں کو اپنانے کا اہل تھا ۔

آج ہندوستان ایک خود مختار جمہوری جمہوریہ ہے ۔ اس کی لمبی اور رنگا رنگ تاریخ میں غالباً پہلی بار پورا ملک ایک انتظام، ایک دستور اور ایک جھنڈے کے نیچے آیا ہے ۔ ملک کے بڑے بوڑھے لوگوں نے قوم کے لئے ایک قانونی اور دستوری ڈھانچہ تیار کر دیا ہے اور اسے قانونی وحدت بھی بخشی ہے ۔ ان چیزوں کو بہتر بنانا اور اس اتحاد کو واقعی اور حقیقی بنانا ایک ایسا

نئی دہلی میں انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹیول کے موقع پر افتتاحی تقریر ۔ یکم نومبر ۱۹۵۷ء ۔

کام ہے جس کی زیادہ تر ذمہ داری ملک کے نوجوانوں پر ہے ۔ اور یہ کام صرف آپ کھلے دماغ اور زندگی سے متعلق وسیع نقطۂ نظر رکھ کر بڑی کامیابی سے کر سکتے ہیں ۔ اگر آپ تنگ نظری کو چھوڑ دیں، برابری اور مساوات کے اصولوں کو تسلیم کر لیں، فرقہ بندی، ذات پات اور طبقہ پرستی سے بلند ہو جائیں اور صوبائی یا علاقائی تعصبات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں تو آپ یہ کام ضرور کر سکیں گے ۔ یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ آزاد ہندوستان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ میرے جیسے لوگ جنھیں ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنی پڑی ہے جسے غیر ملکی چلاتے تھے اس معاملے میں ہم آپ پر رشک کر سکتے ہیں ۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ پورا ملک تعمیرِ نو کے پروگراموں پر عمل در آمد کرنے میں لگا ہوا ہے ۔ بند بنائے جا رہے ہیں ۔ نہریں کھودی جا رہی ہیں، بھاری صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں، گاؤں کے لوگوں کے لئے نئی سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں اور ملک کی معاشی ترقی کے لئے ہر ممکن قدم اٹھایا جا رہا ہے ۔ ان سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں یقیناً آپ بھی مدد دے سکتے ہیں ۔ گاؤں اور شہروں میں کام کر کے اگر آپ کسی کام کو براہ راست اپنے ہاتھوں میں لے لیں تو یقیناً بڑی اچھی بات ہو گی ورنہ آپ رواداری کے جذبے کو اپنا کر بھی اپنا فرض ادا کر سکتے ہیں ۔ اس سے وسیع النظری کی طاقتوں میں زور پیدا ہو گا ۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ جلدی یا بدیر آپ کو بڑی بھاری ذمہ داریاں اٹھانی ہوں گی ۔ آپ مستقبل کی قوم ہیں اور تعمیرِ نو کے کاموں کو مکمل کرنے کا بوجھ آپ کو ہی اٹھانا ہو گا ۔ ہمیں جو مواقع ملے ہم نے ان سے بہترین طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ہندوستان کو خوش حال بنانے کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے کیا ۔ لیکن مجھے اس میں کبھی شک نہیں ہے کہ ہماری قوم کی سب سے بیش قیمت دولت ہمارے نوجوان ہیں ۔ لہٰذا میں آپ سے کہوں گا کہ اپنے خیال و عمل کو جدید حالات کے سانچے میں ڈھالیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ، اس پرانے دیش کی قدیم روایات سے بھی منحرف نہ ہوں ۔

ہندی، انگریزی اور علاقائی زبانیں

ذریعۂ تعلیم نہ صرف علم حاصل کرنے میں دلچسپی پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے بلکہ مختلف مضامین میں اعلیٰ درجے کی صلاحیت حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی بات نہیں اگر ہماری حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ ہماری اپنی زبانیں یونیورسٹی کی سطح تک ذریعۂ تعلیم کا ذریعہ بنیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لٹریچر کو ترقّی دی جائے جو اعلیٰ درجوں میں پڑھنے والے طلباء کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ بہرحال یہ ایسا مسئلہ ہے جو وقت کے ساتھ حل ہو جائے گا۔

کسی ریاستی زبان اور ہندی کے درمیان کسی نزاع یا اختلاف کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میرے خیال میں اگر کوئی کشمکش ہے تو وہ انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے درمیان ہے جس میں ہندی بھی شامل ہے۔ اور یہ کشمکش بھی صرف اس سلسلے میں ہے کہ سرکاری مقاصد کے لئے کون سی زبان استعمال ہوگی۔ ہمیں اپنی زبانوں کو ترقّی دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ دنیا کی مالدارترین زبانوں میں جگہیں پا سکیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں اس طرح ترقّی دی جا سکتی ہے۔ چوں کہ زیادہ تر زبانوں کی پشت پر سنسکرت جیسی مالدار زبان ہے اس لئے بلاشبہ یہ زبانیں فنی اصطلاحات اور ذریعۂ اظہار کی دوسری کمیوں کو اس کی مدد سے دور کر سکتی ہیں۔ فنی اصطلاحات کے معاملے میں ہمارا رویہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ کسی ایک زبان کا ہے یا دوسری زبان کا۔ مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ مقبول بنایا جائے اور اگر کوئی انگریزی لفظ اتنا مقبول ہو چکا ہے کہ اسے باقی رکھا جائے

حیدرآباد میں تیلگو اکیڈمی آف سائنس اینڈ ہسٹری کا افتتاح کرتے وقت تقریر۔ ۲۱ اگست ۱۹۵۹ء

تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی طرز اظہار یا اسلوب بھی باقی رکھا جائے تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ ایسے معاملوں میں ہمیں بیچ کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ کون سا راستہ کارآمد ہے اور کس میں سہولت ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے ادارے میں جو کام ہوگا اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ ممکن ہو جائے گا کہ آپ کی زبان تیلگو مالا مال ہو جائے اور آندھرا پردیش کی یونیورسٹیوں میں ڈگری اور ڈاکٹریٹ کی سطح تک استعمال ہو اور اس طرح ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ایک غیر ملکی زبان باقی رہنے کا کوئی جواز نہ رہ جائے۔ میں یہ سوچ نہیں سکتا کہ ایک آزاد ملک اپنے انتظامی اور کاروباری کاموں کے لئے ایک غیر ملکی زبان پر منحصر رہے خواہ یہ زبان کتنی ہی مال دار کیوں نہ ہو۔ ہمیں غیر ملکی زبانیں سیکھنے خصوصاً انگریزی جیسی وسیع زبان سیکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہونی چاہیئے اس سے ہم نے کافی فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ لیکن انگریزی کو ہماری اپنی زبانوں کے سروں پر مسلّط رکھنا بالکل دوسری بات ہے۔ جتنی جلد ہم اپنی زبانوں کو اپنا لیں اُتنا ہی ہمارے لئے اچھا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ اس اقدام کو مناسب سمجھیں گے کیوں کہ اب ملک میں ان مٹھی بھر لوگوں کی مرضی نہیں جو انگریزی کے ذریعۂ تعلیم پائے ہوئے ہیں بلکہ عوام کی خواہش اہمیت رکھتی ہے۔ اور عوام سے تعلق اور رابطہ صرف علاقائی زبانوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اس وقت ہمیں اس کے لئے زیادہ پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ کُل ہند زبان کون سی ہونی چاہیئے۔ فی الحال ہمیں اپنے آپ کو علاقائی زبانوں تک محدود رکھنا چاہیئے اور جب ایک بار اس کا فیصلہ ہو جائے اور یہ مسئلہ عملی طور پر طے ہو جائے کہ آندھرا میں تلگو، تامل ناڈ میں تامل، ہندی کے علاقوں میں ہندی، بنگال میں بنگلہ، مہاراشٹر میں مراٹھی، گجرات میں گجراتی، اڑیسہ میں اڑیا اور آسام میں آسامی زبان رائج ہوگی تو مجھے یقین ہے کہ ہمیں کُل ہند مقاصد کے لئے کسی ایک زبان کے متعلق طے کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

ہندی اس وجہ سے کُل ہند مقاصد کے لئے استعمال ہونے والی زبان نہیں بنائی گئی ہے کہ یہ دُوسری زبانوں سے برتر ہے یا دُوسری زبانوں کے ادب کے مقابلے میں اس کا ادب بڑا مالا مال ہے بلکہ صرف تجربے کی بناء پر ایسا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ بغیر کسی دقت کے انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے۔ لہٰذا مجھے اس کے بارے میں ایسی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے کہ میں ہمیشہ اسی کے بارے میں باتیں کرتا رہوں۔ ہندی بولنے والوں کی کوششوں کے بغیر معاملات خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اس کے سوا کوئی دُوسری زبان ایسی نہیں ہے جو کُل ہند مقاصد کے لئے استعمال کی جا سکے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب لوگوں کو انگریزی یا کسی ہندوستانی زبان یا ایک ہندوستانی زبان اور دُوسری ہندوستانی زبان کے درمیان انتخاب کرنا ہوگا تو وہ زبان ہندی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اور جب ایسا ہو اور یقیناً ایک دن ایسا ہوگا تو ہندی حقیقی معنوں میں اتفاق و اتحاد کی ایسی ڈور بن جائے گی جیسی ماضی میں سنسکرت تھی اور جو اُتر دکھن اور پُورب پچھم کو ایک ساتھ باندھے ہوئے تھی۔

پُرانے آدرش اور حقیقت

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اور جہاں مختلف عقیدوں کو ماننے والے رہتے ہیں۔ ملک کے ہر حصّے نے بھارتی سنسکرتی، ساہتیہ اور کلا کو ترقّی دینے میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ گو کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے کرناٹک کی تاریخ کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے لیکن میں اس کی عظیم ادبی روایات سے واقف

کرناٹک یونیورسٹی۔ دھارواڑ کا کنوکیشن ایڈریس۔ ۷ر نومبر ۱۹۵۹ء

ہوں اور جانتا ہوں کہ جہاں بڑے بڑے سنتوں، درویشوں اور فلسفیوں کا جمگھٹا رہا ہے۔
آپ کا مذہبی اور غیر مذہبی ادب نہایت بلند خیالات اور اعلیٰ و ارفع جذبات سے بھرپور
ہے اور زمانہ گذشتہ میں ان طاقتوں میں رہا ہے جنھوں نے نہ صرف کرناٹک والوں کو بلکہ ملک
کے دُور دراز حصّوں میں رہنے والوں کو قائم اور سنبھالے رکھا ہے۔ اس نے لوگوں کی زندگیوں
کو مالا مال بنایا ہے، ہماری روایات کو وقار بخشا ہے اور فنونِ لطیفہ کی ترقی کے لئے مناسب
حالات پیدا کئے ہیں۔ گو کہ یہ تمام باتیں کرناٹک میں ہوئی ہیں مگر ان کا اثر پورے ملک پر پڑا ہے۔
ہندوستان کے مقامی کلچروں اور مختلف روایات میں جو رنگا رنگی نظر آتی ہے وہ میرا دل موہ لیتی ہے۔ غالباً
یہ دل کشی صرف رنگا رنگی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بعض بنیادی تصوّرات اور عقائد کی ایک ایسی ڈور بھی
ہے جو سب کو باندھے ہوئے ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس اتحاد کی جڑیں اس سے کہیں گہری ہیں جتنا ہم میں سے بہتوں کا خیال ہے اور
اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان جڑوں کو ایک ہی وسیلے سے زندگی ملتی ہے اور وہ یہ ہے
خیالوں اور آدرشوں کے متعلق ایک مشترک عقیدہ اور انسانی وجود کی غرض و غایت کے بارے میں
ایک جیسا نظریہ اپنی لمبی تاریخ میں ہندوستان نے کبھی لوگوں کے ذہنوں پر پہرہ نہیں لگایا یہاں کے
لوگ سوچ بچار میں ہمیشہ آزاد رہے ہیں حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ یہاں کا تفکر روحانی بلندیوں
کو چھُو رہا تھا اور ہندوستانی فلسفے کے مختلف نظام نشو و نما پا رہے تھے ہندوستانی فکر و خیال
کی سب سے دل چسپ خصوصیت اس کی رنگا رنگی تھی۔ اس کی وجہ سوچنے سمجھنے اور فلسفیانہ انداز
نظر اختیار کرنے کی پوری پوری آزادی تھی۔ اس آزادی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے
کہ ہندوستانی فلسفے کے چھ اسکولوں میں سے نصف ایسے تھے جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے
کہ وہ خدا کے وجود میں یقین نہ رکھتے تھے اور بقیہ تینوں میں بھی جو خدا کے وجود کے قائل تھے
خدا سے متعلق ان کے بنیادی تصوّرات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ ذہنی اور جذباتی
طور پر لوگوں میں اس حیرت انگیز اختلاف اور رنگا رنگی کے باوجود ان کے تہذیبی اتحاد کو

کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہُوا اور روزانہ زندگی میں اہمیت رکھنے والے معاملات اور چیزوں سے متعلق عقائد اور خیالات میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا۔

لہٰذا ہمیں ان لوگوں کا شکرگذار ہونا چاہیئے جنھوں نے ہمارے ابتدائی معتقدات اور نظریات کی بنیادیں ڈالیں جن سے مختلف رنگوں اور نمونوں میں ہماری تہذیب کا پیچیدہ تانا بانا بُنا گیا ہے۔ بھگتی اور معرفت کے پرچار کا جو دھارا کرناٹک سے نکلا تھا اس نے اس نمونے کو برقرار رکھنے میں بڑی مدد دی ہے۔

ماضی میں ہندوستان کے تعمیری مزاج اور ذہانت کا ملک کے اندر اور باہر بڑا متنوع اور رنگا رنگ اظہار ہُوا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی اور دستوری آزادی حاصل ہو جانے کے بعد یہ توقّع رکھنا بہت زیادہ نہیں ہوگا کہ ایک بار پھر یہ پُوری طرح پھلے پھُولے گا اور تحمل، پیار اور رواداری کے ہمارے قدیم ترین آدرشوں کو آگے بڑھانے میں معاون ہوگا۔ انسانی تاریخ میں پہلے کبھی یہ آدرش واضح حقیقت اور کارآگہی کے اتنے قریب نہیں آئے تھے جتنے آج ہیں۔ یہ عقائد اور آدرش جو ہمیں بے حد عزیز ہیں انھیں ہماری اپنی تاریخ میں اس سے بڑے خطرے کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا تھا جتنا آج انھیں درپیش ہے۔ اب جب کہ غور و فکر کرنے والی پُوری دنیا بتدریج ہمارے قدیم عقائد و خیالات کی طرف آ رہی ہے تو ہم ان کی طرف سے منہ نہیں موڑ سکتے اور ان چیزوں کو ترک نہیں کر سکتے جنھوں نے ہمیں زندہ رکھا ہے۔

بعض حلقوں میں کلچر کو ثانوی حیثیت دینے اور اسے بیکاری کا مشغلہ سمجھ کر کوئی خاص اہمیت نہ دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس کی اہمیت محسوس کرنے اور اسے زندہ اور متحرک کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں تو دُوسرے سرے پر پہونچ جاتے ہیں اور کلچر کو بینڈ باجے اور موسیقی کے مضحک ہنگاموں میں اُلجھا کر اس کا ایک گھٹیا تصور پیش کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کلچر کوئی اتنی پاکیزہ چیز ہے جو خوش کرنے والی یا تفریحی چیزوں کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن اس کو سوانگ بھرنے یا تھیٹر کے تماشے کے مترادف سمجھنا یقیناً غلط ہے۔

کلچر بنیادی طور سے کسی قوم یا فرقے کے اندرونی جذبات یا اجتماعی خیالات کا اظہار ہے جو صدیوں کے تجربے سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ رہن سہن کا ایک انداز ہے جو موجودہ نسلوں کا گذری ہوئی نسلوں سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ جس تانے بانے سے اس کی بافت ہوتی ہے وہ ہمیشہ سطح پر دکھائی نہیں دیتے لیکن غور و فکر کرنے والے لوگ ان انگلیوں کو جانتے ہیں جو ان ریشمی دھاگوں کو حرکت دیتی رہتی ہیں وہ انگلیاں جو وقت کی گرفت سے آزاد اس کو بننے میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں۔ محدود معنوں میں یہ درست ہے کہ وقتی مسئلہ کلچرل مسائل پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تہذیبی مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسانی ذہن پر اُن کی چھاپ اتنی گہری ہوتی ہے کہ کسی عارضی عدم توجہی کی وجہ سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ اس کے برعکس وقتی اہمیت رکھنے والے مسائل سطح پر ہوتے ہیں اور جوں ہی اُن کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے ان کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ان دو سرگرمیوں میں امتیاز کرنے میں انسانی سماج کی بھلائی ہے کیوں کہ اس سے وقتی مسائل اور تہذیبی قدر و قیمت کی حامل سرگرمیوں میں نزاع اور تصادم کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

تہذیبی دھارے کا مسلسل بہاؤ کسی قوم کی طاقت اور وسیع معنوں میں اس کے کردار اور زندہ رہنے کی صلاحیت کا تعین کرتا ہے۔ لیکن سطح پر دکھائی دینے والی غریبی اور دُکھ تکلیف کے مقابلے میں جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا کلچر بڑا مالا مال اور شاندار ہے تو یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ کلچر اور اس کی شاندار روایات کے بارے میں دوسرے ہمارا نقطۂ نظر سمجھیں اور انھیں پسند کریں تو ہمیں اس میں اور اپنی اصلی زندگی کے ظاہری مظاہر کے درمیان کسی قسم کی ہم آہنگی پیدا کرنی ضروری ہوگی۔ صحت مند تہذیبی روایات اور ایک ایسا سماج جس میں اونچ نیچ ہو ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اپنے سماج کو از سرِ نو تعمیر کرنے کے لئے ہماری اجتماعی کوششیں بڑی

کارآمد ہوں گی تاکہ ہم ہندوستان میں خوش حالی اور فارغ البالی کا نیا دور لاسکیں۔ ایسی کوششیں اس وقت کامیاب ہوں گی جب ہم اپنے تہذیبی ورثہ سے تخلیقی تحریک حاصل کریں اور اس کے بنیادی تصورات اور عقائد کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی سعی کریں۔

میرے خیال میں یونیورسٹیاں ایسی مناسب جگہیں ہیں جہاں سے ان خیالات کا دھارا بہنا چاہیئے۔ ان علمی مرکزوں کو دیکھنا چاہیئے کہ قوم کے شریانوں میں کلچر کا خون صالح مناسب مقدار میں اس طرح پہونچے کہ جزوِ بدن بن جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک کٹر مادہ پرست بھی خیالات کی طاقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ کیا مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں تسلسل ہوتا ہے جو پرکھوں سے آنے والی نسلوں کو ملتا ہے۔ ان میں ایسی خوبیاں ہوتی ہیں۔ کچھ ایسی بات ہوتی ہے جس کی جڑیں ماضی میں ہوتی ہیں یہ یونیورسٹیوں کا کام ہے کہ ان کو اس طرح پیش کریں جسے عام آدمی بھی سمجھ سکیں۔

سنٹ تھامس کی کہانی

یہ ایک ایسا موقع ہے جب ہم ایک بزرگ ہستی کو یاد کرکے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہستی اُنیس سو برس سے بھی پہلے ہندوستان آئی تھی اور جس نے یہاں عیسائی دھرم کا پرچار کیا تھا۔ اور مدراس میں میلاپور کے مقام پر اپنی زندگی کے آخری ایام گذارے تھے۔ نکتہ چین مورخوں کو مطمئن کرنے کے لئے ممکن ہے کافی تاریخی شہادتیں موجود ہوں یا نہ ہوں لیکن سنٹ تھامس کا ہندوستان آنا اور عیسائیت کی تبلیغ کرنا شک وشبے

---

۳ دسمبر ۱۹۵۹ء کو سنٹ تھامس ڈے کے موقع پر تقریر۔

سے بالاتر ہے۔ شام اور اسکندریہ کی قدیم روایتیں ہمارے ملک کی قدیم روایتوں کے مطابق ہیں اور اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔

سنٹ تھامس کی کہانی سے فیضان حاصل کرنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کے بارے میں مستند و معتبر تاریخی شہادتیں موجود ہیں یا نہیں۔ جو بات ہمیں متاثر کرتی ہے اور جس پر ہم سب، عیسائی اور غیر عیسائی فخر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب یہ پہلے مبلغ مالابار کے ساحل پر اترے تو انھوں نے یہاں بس جانے اور بلا کسی روک ٹوک کے عیسائی مذہب کا پرچار کرنے کے لئے اس سرزمین کو مناسب اور موافق پایا۔ صرف یہی بات نہیں ہے بلکہ قدیم روایتوں سے اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ سنٹ تھامس اور ان کے نئے مذہب کے ساتھ عام آدمیوں نے رواداری دکھائی اور بعض حالتوں میں کچھ حکمرانوں نے بھی ان کی سرپرستی کی۔ اس بات کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرنے کے لئے ہمیں ان حالات اور مذہبی فضا کو سمجھنا ہوگا جو اس وقت کے ہندوستان میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بُدھ مذہب ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں اختیار کر لیا گیا تھا جس میں جنوبی ہندوستان بھی شامل تھا۔ شہنشاہ اشوک کے ذریعے یہ نئی روشنی لنکا پہونچ چکی تھی اور ہندوستانی تاجر اور بحری سیاح اپنے ساتھ اپنے مذہبی خیالات اور تہذیبی روایات کو وسطی اور جنوب مشرق ایشیا کے ملکوں میں لے جا رہے تھے۔ یہ بات یقیناً حیرت کا باعث ہوتی اگر ہندوستانی عوام عیسائی دھرم کے اصولوں کے ساتھ غیر رواداری برتتے جب کہ ان کی تہذیبوں اور مذہبوں کو اُن بہت سے ملکوں نے جن سے ان کا رابطہ ہوا تھا خوش آمدید کہا تھا اور بعد میں قبول کر لیا تھا۔ اس لئے سنٹ تھامس کے ہندوستان آنے کی قدیم کہانی اور جنوبی ہندوستان میں عیسائیت کی نشانیاں ہمارے لئے اتنی ہی قابل فخر ہیں جتنی ملایا کے مجمع الجزائر، کمبوڈیا کے گھنے جنگلوں اور وسطی ایشیا کے لق و دق صحراؤں میں بکھری ہوئی قدیم عمارتیں۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ سنٹ تھامس کے بارے میں جو کہانی ہم تک پہونچی ہے

وہ یقیناً ان روایات کا ایک حصہ ہے جس نے ہندوستان کے تہذیبی ورثے کی تشکیل کی ہے۔

ہمارے ملک کے عوام کی ایک خاص خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ ہر مذہب کے پیغمبروں اور بزرگوں کی تنظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ماضی اور حال کے اندرونی اختلافات اور تاریخ میں مذکور متعدد خونی جنگوں کے باوجود میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اس ملک کی آب و ہوا میں کوئی ایسی انوکھی بات ہے جس نے زمانہ دراز سے اس ملک کے لوگوں کو مذہب کی دولت سے نہ صرف مالا مال کر رکھا ہے بلکہ اس دولت کو باقی بھی رکھا ہے خواہ یہ کسی ذریعے سے آئی ہو یہی خصوصیت بدھ مت کے تیزی سے پھیلنے کی بھی ذمہ دار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی معاملات میں انفرادی آزادی کی بھی علم بردار ہے جس کی وجہ سے نسلاً بعد نسلاً ہندو مذہب اور بودھ مذہب نے ایک ہی خطے، ایک ہی گلی اور اکثر ایک ہی مکان میں ساتھ ساتھ فروغ پایا۔ ہم اب جانتے ہیں کہ جب وادی کرشنا اپنے انتہائی عروج پر تھی اور جب ناگ ارجن کونڈ علم کی مشعل بلند کئے ہوئے تھا تو زیادہ تر صورتوں میں مرد برہمن عقائد کو ماننے والے تھے اور عورتیں بودھ مذہب کی پیرو تھیں۔ ناگ ارجن کونڈ کی خاص خاص چیتہ (خانقاہیں) اور دوسری بدھ عمارتیں سات واہنوں کے دارالخلافہ پراتی شان پور کے نزدیک سری پربت کی رانیوں اور دوسری عورتوں کے جوش و خروش اور چندے سے تعمیر ہوئی ہیں۔ اسی طرح کے واقعات انسان کی بے تعصبی اور محبت و رواداری کے جذبات کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے تاریخ میں دلکشی پیدا ہوتی ہے اور کسی قوم کی روایات مالا مال ہوتی ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ سنٹ تھامس ڈے منانے کا جذبہ ہر سال زور پکڑتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ یہ عیسائیوں کے لئے ایک متبرک دن ہے لیکن دوسروں کے لئے بھی کم مقدس نہیں ہے کیوں کہ یہ قادر مطلق کا فیصلہ تھا کہ ہندوستان مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گوناگوں مرقع ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بہت سے مذاہب اور تہذیبیں یہاں آکر ایک دوسرے سے ملیں اور ان میں ایک طرح کا امتزاج پیدا ہوا۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ماضی

کو بھلا دیں اور حال پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہندوستان کی زندگی میں تہذیبوں اور مذاہب کا رنگا رنگ مرقع نظر آئے گا۔ اور میں اس کو نہایت قیمتی خزانہ سمجھتا ہوں۔ جدید ہندوستان کے جنم داتا نے یہ بات ہمارے دلوں میں بٹھا دی تھی اور شکر گزار قوم نے اسے ہندوستان جمہوریہ کے دستور میں شامل کر کے ہر فرد کو مذہبی آزادی کی ضمانت دے دی ہے۔ ہم سبھوں کو ہر طرح سے اپنے مذہب کا سچا پیرو اور وفادار ہونا چاہئے لیکن اس سے آپس میں ہم آہنگی اور باہمی سمجھداری پیدا ہونی چاہئے الگ تھلگ رہنے یا مخالفت کا جذبہ نہیں۔ آج کے دن جب کہ ہم سنٹ تھامس کے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کی تقریب منا رہے ہیں یہی خیال میرے ذہن میں آتا ہے۔ بلاشبہ ہماری تاریخ میں یہ ایک مہان دن ہے۔ اس سے اس دن کی یاد تازہ ہوتی ہے جب ایک عظیم مذہب ہمارے ملک میں آیا تھا اور جس طریقے سے لوگوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ صحیح مذہب کے جذبے کا مظہر ہے جسے اس قدیم ملک کے لوگوں نے ہمیشہ باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار ـــــ امیر خسرو

اس زمانے میں جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے کافی نزدیک نہیں آئے تھے اور دونوں فرقوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی خسرو نے اپنے روحانی استاد حضرت نظام الدین کی ترغیب و مدد سے دونوں فرقوں کو نزدیک لانے کی کوشش کی۔ اس سے ان کی دور اندیشی اور بے تعصبی کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کام کو ہاتھ میں لینے سے پہلے انھوں نے دونوں مذاہب اسلام اور ہندو مت کے تاریخی اور روایتی پس منظر سے پوری پوری واقفیت حاصل کی۔

فارسی اور عربی کے علاوہ خسرو نے سنسکرت اور ہندو مت کے بعض بنیادی شاستروں کا بھی مطالعہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ دونوں فرقوں کے الگ تھلگ رہنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ دونوں مختلف زبانیں بولتے ہیں جس سے سماجی روابط قائم کرنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس مشکل کو دُور کرنے کے لئے انھوں نے اس وقت بولی اور لکھی جانے والی زبانوں کے ساتھ تجربے شروع کئے۔ ان کا مقصد ذریعۂ اظہار کا ایک مشترک وسیلہ تلاش کرنا تھا۔ انھوں نے ایسی زبان میں لکھنا شروع کیا جو اس وقت دلّی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں سبھی لوگ سمجھتے تھے۔ جو زبان انھوں نے سات سو برس سے بھی پہلے لکھی اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے جدید ہندی اور اُردو کی بنیاد ڈالی۔

ہمیں اس وقت اُردو اور ہندی کے نزاع میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ان زبانوں کے ارتقاء پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ خسرو کی تحریریں، جدید ہندستانی یا اُردو یا ہندی کے غالباً سب سے ابتدائی نمونے ہیں۔ اپنے مخصوص اور بے مثل انداز میں انھوں نے سنسکرت اور فارسی کے ایسے الفاظ کو جمع کرنا شروع کیا جنھیں عام طور سے سمجھا جاتا تھا اور انھیں مقامی بولیوں میں استعمال کرنا شروع کیا اس طرح خسرو نے ایک ایسا طرزِ تحریر نکالا جنھیں موجودہ ہندی اور اُردو کا منبع کہا جاتا ہے۔ ہندوستان اور اس کے ادب کو امیر خسرو کی یہ سب سے بڑی دین ہے۔

کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کام خسرو نے سماجی میدان میں کیا ہے وہ زبان و ادب کے میدان میں ان کے کارہائے نمایاں سے زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی ابتداء کی نشان دہی امیر خسرو کی اولین کوششوں میں کی جا سکتی ہے۔ جن مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنا لیا تھا ان کے عقائد اور رہن سہن کے بارے میں خسرو نے بہت کچھ لکھا اور کہا ہے۔ اس کی دوسری طرف انھوں نے مسلمانوں کے فائدے کے لئے ہندوؤں کے قدیم فلسفے اور طرزِ زندگی کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کے درمیان جو فاصلہ

بھاؤ کم ہونے لگا۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی وجہ سے دونوں میں سماجی تعلقات بڑھنے لگے اور دونوں فرقے ایک دوسرے کے نزدیک آنے لگے۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ امیر خسرو اور دوسرے صوفیوں اور سنتوں کے پرچار کی وجہ سے چودھویں صدی اور اس کے بعد دہلی کی سلطنت کی بنیاد اور حکومت میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس لئے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ خسرو کو پسند کرنے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں نظر آتے ہیں۔

حالانکہ امیر خسرو کا عرس صدیوں سے سال بہ سال منایا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں اس تقریب کو منانے کی خاص وجہیں ہیں۔ آج ہندوستان ایک آزاد ملک ہے ایک ایسا ملک جس کا دستور اپنے تمام شہریوں کو مساوی حقوق دیتا ہے اور یہاں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو افضل سمجھے یا کوئی اس بات سے ڈرے کہ ذات، یا مذہب کی بنیاد پر اسے کمتر قرار دیا جائے گا۔ قانون اور دستور کی نگاہوں میں تمام شہری یکساں درجہ رکھتے ہیں۔ ہم ہندوستانی اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہزاروں برسوں سے مختلف مذاہب کو ماننے والے اور مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اس ملک میں رہتے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ آج بھی شاید ہی کوئی ایسا زندہ مذہب ہوگا جس کے ماننے والے تھوڑی یا بہت تعداد میں اس ملک میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی تہذیب کی بوقلمونی پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اسے اپنے لئے رحمت سمجھتے ہیں۔

لیکن صرف یہی کہنا کافی نہیں ہے۔ اگر ہم اس پر فخر کرنا چاہتے ہیں اور اس بوقلمونی کو ایک رحمت سمجھتے ہیں تو ہمیں کچھ ایسے کام کرنے ہوں گے جس سے یہ بات واقعی حقیقت بن جائے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتنا چاہئے اور میل و محبت کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔ اس ملک میں رہنے والے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو محسوس ہونا چاہئے کہ انھیں یہاں رہنے اور اپنے پسند کے مذہب پر عمل کرنے کا مساوی حق حاصل ہے۔ ہمارے دستور کا یہ ایک نہایت بنیادی اصول ہے اور ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ مساوات

اور رواداری کے جذبے کو پروان چڑھانے میں مدد دے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے امیر خسرو کا عرس منانے اور ان جیسے آدمیوں کی خدمات کا اعتراف کرنے والی تقاریب سے زیادہ اور کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔ خدا اور مذہب میں اعتقاد رکھنا اور اس کی تمام مخلوق کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا ایک ہی بات ہے۔ دوسری باتوں کے مقابلے میں اس حقیقت کو حضرت نظام الدین اور امیر خسرو جیسے لوگوں کی زندگیاں کہیں زیادہ بہتر طور سے پیش کرتی ہیں۔

ہندی کسی پر زبردستی عائد نہیں کی جائے گی

ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانے سے بہت پہلے ہی حیدر آباد کو ہندی کی ترویج و اشاعت کے لئے نہایت سازگار سمجھا جاتا تھا۔ دراصل حیدر آباد اور آس پاس کے علاقے جنہیں تاریخ میں دکن کہا گیا ہے، لسانی تجربوں کے لئے ایک تجربہ گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لگ بھگ پانچ سو برس پہلے جب مسلمان بادشاہوں نے یہاں اپنی سلطنتیں قائم کرلیں اور ان میں بس گئے تو فارسی اور شمالی ہندوستان کی دوسری زبانیں ان کے ساتھ دکن پہونچیں۔ جنوبی اور شمالی ہندوستان کی زبانوں کی آمیزش سے ایک مشترک زبان تیار ہونے میں بڑی مدد ملی جسے ہندو اور مسلمان دونوں سمجھتے اور استعمال کرتے تھے۔ ہمیں اُردو اور ہندی کو بنیادی طور سے ایک زبان سمجھنا چاہئے۔ چاہے ہم اس زبان کو جس نام سے پکاریں دکھنی کے ادیبوں اور سرپرستوں نے اس کے ارتقاء میں کافی حصہ لیا ہے۔

---

۱۳ اگست ۱۹۶۰ء کو حیدر آباد ہندی پرچار سبھا کا کانوکیشن ایڈریس۔

اور یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا پوری ہندی دنیا حیدر آباد اور دکن کے لوگوں کے احسان سے زیر بار ہے۔ ہندی اور ہندی کی ملک میں ترویج و اشاعت کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے پہلے میں چاہوں گا کہ کچھ ایسی باتیں کہوں جو ہمارے غیر ہندی دان بھائیوں کے شکوک و شبہات کو ختم کر دیں۔ مجھے اس کا پورا احساس اور خیال ہے کہ کسی شخص کی زندگی میں اس کی مادری زبان کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ جب ہم کسی علاقے میں کسی زبان کے پرچار کی باتیں کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ سوال پوچھا جانا چاہیئے۔ کیا اس قدم سے اس علاقے کی مادری زبان پر کوئی برا اثر پڑنے کا امکان ہے اور اس علاقے کے لوگوں کی مادری زبان کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی حفاظت کے لیئے تمام ممکن اقدام اُٹھائے جا چکے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ غیر ہندی دان علاقے کے کسی شخص کو اس بارے میں کوئی شک یا شبہ ہو گا۔ ہندوستان کے دستور میں تمام علاقائی زبانوں اور ان کے مفادات کا پورا تحفظ کر دیا گیا ہے اور ریاستی حکومتوں کو ان زبانوں کو ترقی دینے اور ان کی ہمت افزائی کرنے کے لیئے پورے پورے اختیارات دئے گئے ہیں تاکہ وہ ریاستوں کے انتظامی اور روزمرہ کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ حد تک استعمال کی جا سکیں۔

دوسرا سوال اس زبان کے مطالعے کا پیدا ہوتا ہے جس کے بارے میں قوم کے نمائندوں نے فیصلہ کیا ہے کہ قومی مفاد کی خاطر کچھ مخصوص کُل ہند مقاصد کے لیئے استعمال کی جائے۔ میں جانتا ہوں کہ ملک میں بعض ایسے اہم علاقے ہیں جہاں ہندی لوگوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ان علاقے کے لوگوں کو اس زبان کو سیکھنے میں کچھ دقت ہو۔ مخصوص مقاصد کے لئے ہندی کو استعمال کرنے کا جیسا کہ دستور میں دیا گیا ہے پروگرام بناتے وقت اس دقت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ مستقبل میں بھی جب زبان سے متعلق پالیسی کا جائزہ لیا جائے گا یا اس کے بارے میں کوئی غور و خوض کیا جائے گا تو ہمارے غیر ہندی دان بھائیوں کی مشکلات یا احساسات کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے

وزیر اعظم نے لوک سبھا اور پبلک جلسوں میں بارہا کہا ہے کہ ہندی کسی پر جبراً عائد نہیں کی جائے گی۔ سرکاری زبان کے کمیشن کی سفارشوں اور پارلیمانی کمیٹی کی رائیوں کی بنیاد پر حکومت نے جو فیصلے کئے ہیں ان کی روشنی میں صورت حال کی کئی بار وضاحت کی جا چکی ہے۔ اور صرف دو دن پہلے لوک سبھا میں ہمارے وزیر داخلہ نے ایک پھر اس بات کا اظہار کیا ہے۔

لہٰذا میں غیر ہندی دان علاقے میں رہنے والے بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ اس بات کو سوچیں کہ ایک آزاد اور باعزت قوم کے فرد ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض کیا ہے۔ قومی اتحاد اور مستقبل کی سالمیت کی خاطر اٹھایا ہوا کوئی قدم محض اس وجہ سے نامناسب نہیں ہو سکتا کہ اگر اس پر عمل کیا گیا تو یہ ہمارے عوام کے بعض طبقوں کے لئے آسان ہوگا۔ ہمیں اس سوال پر کُل ہند نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔ بلاشبہ اگر اس سے یہ احتمال پیدا ہو کہ یہ قدم ہمارے عوام کے ایک طبقے کے لئے امتیاز پیدا کرنے والا ہوگا یا اس سے انھیں مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس شبہے کو دُور کیا جا سکتا تھا بلکہ ضرور دُور کر دینا چاہیئے۔

اس موقع پر اگر میں نے ہندی کے بارے میں باتیں کہی ہیں تو غالباً آپ اسے نامناسب نہ سمجھیں گے۔ ہندی جو سارے دیس میں گھومنے پھرنے والے سادھوؤں اور بھکشوؤں کی بولی کی براہ راست پیداوار ہے کس طرح اپنی موجودہ شکل اختیار کر سکی یہ دیکھنا ماہرین لسانیات کا کام ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جُوں جُوں میں نے ہندی زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کا جائزہ لینے کی کوشش کی مجھے یقین ہوتا گیا کہ چودھویں اور پندرھویں صدی میں جب ہندی بولی سے زبان کا رُوپ دھارن کر رہی تھی تو جنوبی ہندوستان کے سنتوں اور بھکشوؤں نے اس کی ترقّی میں بڑا نمایاں حصّہ لیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ رام اور کرشن بھگتی کی تحریک نے ہندی کو فروغ دینے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے اور بھگتی کی یہ تحریکیں جنوب سے شروع ہو کر شمال میں پھیلی ہیں۔ یہ شری رامانج تھے اور بعد میں

انھیں کے سلسلے کے ایک شاگرد سوامی راما نند رام تھے جو بھگتی کی تحریک کاشی لائے۔ یہ ان ہی کا فیضان تھا کہ بھگتی کی تحریک کا پرچار سنسکرت کے علاوہ علاقائی زبانوں کے ذریعہ بھی ہؤا۔ اور اس طرح اودھی جو پہلے صرف ایک بولی تھی ادبی زبان کی حیثیت سے سامنے آئی۔ اس کے برعکس برج بھاشا ولبھ آچاریہ اور ان کے ماننے والوں کی مرہونِ منت ہے جنھوں نے متھرا میں کرشن بھگتی کی تحریک زور شور سے پھیلائی۔ کرشن بھگتی کی تحریک نے بنگلہ زبان پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جنوبی ہندوستان کے سنتوں نے ہندی زبان کے ارتقاء میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے حالاں کہ ہو سکتا ہے کہ ان کا اصل مقصد محض بھگتی تحریک کی ترویج و اشاعت ہو۔

آپ کے اختیارات

ہمارے ملک کے دو طرف کے کچھ حصے ہم سے کٹ گئے ہیں اور پاکستان کا حصہ ہیں۔ لیکن جو باقی حصہ ہمیں ملا ہے وہ اس سے کہیں بڑا ہے جو کسی زمانے میں کسی ایک سیاسی طاقت کے ماتحت تھا۔ اس کے لیے ہم ذمہ دار ہیں اور ہمارے اجداد بھی لیکن اس سے زیادہ ہم ان کے احسان مند ہوں گے جو ہمارے بعد آئیں گے اور اس ملک کو زیادہ متحد اور زیادہ خوش حال چھوڑ جائیں گے۔ اس عظیم ورثے کی موجودگی میں اور تمام دوسری باتیں جو ملک کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے الگ کرتی ہوں وہ بالکل حقیر اور معمولی نظر آنی چاہئیں۔ ہم نے ایک دستور بنایا ہے جو کسی ایک گروپ یا ایک طرح کے لوگوں نے نہیں تیار

کوئمبتور کے شہریوں کے جلسے میں تقریر۔ ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء۔

کیا ہے بلکہ اس کی تیاری میں پورے ملک کے نمائندوں نے حصّہ لیا ہے جو ملک کے ہر کونے سے آئے تھے۔ یہ دستور ملک کی ہر ریاست کو کچھ حقوق کی ضمانت دیتا ہے جسے مرکز بھی نہیں چھین سکتا اور یہ دستور ملک کی ہر ریاست کو ضمانت دیتا ہے کہ وہ اپنے حدود کے اندر لوگوں کے بہترین مفاد کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنا انتظام چلائے۔ ایک طرف تو یہ خود مختاری دی گئی لیکن دوسری طرف یہ ذمّہ داری بھی ہے کہ ہر ریاست پوری جمہوریہ کو برقرار رکھنے اور مدد دینے کے لئے تیار رہے۔ دستور مرکزی حکومت کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ ریاستوں پر ان معاملوں میں جو اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہیں اپنی مرضی مُسلّط کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دستور مرکز پر یہ بھی ذمّہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ریاست کی بھلائی اور فائدے کے لئے جو بھی ضروری ہو کرے۔ بعض اوقات ملک کے ایک یا دُوسرے حصّے میں بدقسمتی سے کچھ ایسے واقعات ہوجاتے ہیں جو ہماری نگاہوں کو دھندلا دیتے ہیں لیکن ہمیں اس کا پورا پورا احساس ہونا چاہیئے کہ ہمارا ملک ایک ہے اور ہم ایک قوم ہیں۔

جہاں تک اُن انتظامی اقدامات کا سوال ہے جنھیں ممکن ہے آپ بحیثیت ایک شہری پسند نہ کرتے ہوں تو آپ کو انھیں بدلنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حق آپ کو ریاستی اور مرکزی دونوں حکومتوں کے بارے میں حاصل ہے۔ آپ کی ریاستی حکومت ہے اور آپ ہی کی مرکزی حکومت ہے دونوں میں ایسے افراد ہیں جنھیں آپ نے چُنا ہے۔ ان کا انتخاب کرکے آپ نے انھیں اپنا اعتماد سونپا ہے اور جو کام وہ ملک کے لئے فائدہ مند اور بہتر سمجھتے ہیں کرتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ آپ کو اس طاقت کا احساس ہو جو آپ کو حاصل ہے، آپ کو معلوم ہو کہ آپ کتنے طاقت ور ہیں۔ اس طاقت کو احتیاط اور ان تمام تر ذمّہ داریوں کے ساتھ جو اس سے عائد ہوتی ہیں استعمال کرنا چاہیئے۔

میں نے اس مسئلے پر ذرا تفصیلی نظر ڈالی ہے کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ بعض جگہوں پر کچھ ایسے رجحانات دکھائی دیتے ہیں جو میرے خیال میں صحیح نہیں ہیں۔ دستور مرکز کو اور نہ ہی

ریاستوں کو ملک میں کسی قسم کی سامراجیت قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ آپ کو بھی یہ احساس ہونا چاہیئے کہ جن لوگوں نے سامراجیت کے خلاف ہمیشہ جنگ کی ہے وہ خود بھی کسی قسم کی سامراجیت کو پسند نہیں کریں گے۔

لہذا آپ لوگ ہمیشہ یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں کہ یہ ملک ایک اور ناقابلِ تقسیم ہے۔

میں آج صبح کو یہاں پہونچا ہوں۔ تب سے میں نے دو اداروں کو دیکھا ہے جنھیں رام کرشن مشن چلاتا ہے۔ رام کرشن جیسے سنتوں نے ہی اس ملک کو اس سرے سے اس سرے تک ایک دھاگے میں باندھ دیا ہے۔ اس جگہ رام کرشن مشن کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر اتنی ہی مسرّت ہوتی ہے جتنی شمالی ہندوستان میں شنکر آچاریہ کے قائم کئے ہوئے مٹھوں کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ ہمیں یعنی شمالی ہندوستان کے لوگوں کو آپ کی دین نہ صرف شنکر آچاریہ ہیں بلکہ رامانج آچاریہ، رامانند، ولبھ آچاریہ بھی آپ کا عطیہ ہیں۔ اور ان ہی سنتوں کی تعلیمات اور زندگیوں نے ان تمام صدیوں میں ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اس ورثے میں اب سیاسی وحدت کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اس اتحاد کو ہمیشہ باقی اور برقرار رکھنا ہمارا فرض اولین ہونا چاہیئے۔

اپنی سلامتی کا تحفّظ

میں ۳۵ سال کے بعد سیلم آیا ہوں۔ یہ مدّت ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ جب ۱۹۲۵ء میں اس شہر میں آیا تھا تو اس وقت ہم اپنی آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ ہم انگریزی حکومت کے خلاف عدم تشدّد کے ساتھ آخری جدوجہد کے لئے ملک کو تیار کرنے

۱۱ راگست ۱۹۶۰ء کو سیلم میں شہریوں کے جلسے میں تقریر۔

کی کوشش کر رہے تھے۔

ہم سبھوں کو اس کی پوری اُمید تھی کہ ایک نہ ایک دن ہماری کوششیں ضرور کامیاب ہوں گی، لیکن ہم میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ یہ مبارک دن کب آئے گا۔ دو تین سال کے بعد دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی جس کی وجہ سے آگے چل کر بہت بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ میں بات چیت شروع ہوئی اور انجام کار ۱۹۴۷ء میں ہم آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر دستور بنانے کے لئے ملک کے ہر حصّے سے نمائندے جمع ہوئے۔ ملک کا ایک بڑا حصّہ انگریزوں کے زیر اقتدار تھا جس پر وہ براہِ راست حکومت کرتے تھے۔ لیکن ملک کا ایک تہائی حصّہ انگریزوں کے براہِ راست انتظامی کنٹرول میں نہیں تھا۔ سردار پٹیل کی ہوشیاری، تدبّر اور عزمِ مُصمّم کی وجہ سے یہ حصّے بھی جو ہندوستانی راجوں کے زیر انتظام تھے ہندوستان کا حصّہ بن گئے۔ ۱۹۵۰ء میں جب ہم نے جمہوریہ کے قیام کا اعلان کیا تو پورا ملک ایک دستور اور ایک انتظامی کنٹرول کے ماتحت آگیا۔

دستور کی بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اس کے تحت جو حکومت قائم کی گئی ہے وہ عوام کی منتخب کردہ حکومت ہے اور انھیں اس کا حق اور اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی باتیں حکومت سے منوا سکیں۔ اس لئے مجھے اس بات کی وکالت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی تنقید نہ ہونی چاہیئے۔ تنقید کے بغیر اس کا امکان ہے کہ حکومت غلط راستے پر چلی جائے لیکن حکومت کے اقدامات اور پالیسیوں کی نکتہ چینی کرتے ہوئے ہمیں اس کا پورا احساس ہونا چاہیئے کہ ملک کے اتحاد اور سالمیت پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔ اور جب ایک بار اس کی ضمانت ہو جائے تو باقی باتیں لوگوں کی سمجھ داری پر چھوڑ دینی چاہئیں۔ صرف اسی طریقے سے جمہوریت صحیح طور سے کام کر سکتی ہے۔ ایک طرح سے یہ جمہوریت ہمارے لئے نئی ہے اس لئے امکان ہے کہ ہم بعض اوقات ایسی چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں جن کی نہ کوئی اہمیت ہے۔ اور نہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی ضرورت۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ہم جو بھی

مکتہ چینی کریں وہ ملک کو محفوظ اور آزاد رکھنے کی اہم ضرورت کو نظرانداز نہ کرے۔

ہماری قدیم تاریخ، دُنیا میں ہماری موجودہ پوزیشن اور جو کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے ان کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنی سلامتی اور آزادی کے بارے میں محتاط اور چوکس رہیں۔ اپنی لمبی تاریخ میں ہم غیر ملکی حملہ آوروں سے کبھی شکست نہ کھاتے اگر انھیں ہمارے کچھ لوگوں کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ ہمارے عوام کے ایک طبقے نے غیر ملکیوں کی مدد سے عوام کے دُوسرے طبقے کو شکست دی اور اس طرح غیر ملکیوں کو یہاں حکومت کرنے کا موقع فراہم کردیا۔ اس تنگ نظری کی وجہ سے ہمارا ملک کئی مرتبہ غیر ملکیوں کے زیر اقتدار آچکا ہے لہذا ہمیں تنگ نظری بالکل چھوڑ دینی چاہیئے۔ ہمیں اپنے دل و دماغ میں پورے ملک کی محبّت پیدا کرنی چاہیئے۔ اگر ملک کے کسی حصّے کو کوئی نقصان پہونچ جائے تو اسے پورے ملک کا نقصان سمجھنا چاہیئے۔ اب جب کہ پہلی بار پورے ملک میں ایک انتظام اور ایک قانون ہے تو اگر ضرورت پڑے تو ملک کے مفاد کی خاطر انفرادی یا جماعتی مفاد کو قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ جب ہمیں اپنے اس فرض کا احساس ہوگا تب ہی ہم اپنے اوپر حکومت کرنے کے حق کو حق بجانب ثابت کر سکیں گے۔

جمہوریت کی عملی شکل

ہم میں کئی قسم کے اختلافات رہے ہیں۔ مذہبی اختلافات رہے ہیں، بھاشاؤں کا اختلاف رہا ہے۔ ہمارے رہنے سہنے، کپڑے پہننے حتیٰ کہ کھانے پینے میں بھی کافی فرق ہے۔ لیکن ان

۱۲ر اگست ۱۹۶۰ء کو ویلور بار ایسوسی ایشن سے خطاب۔

ظاہری اختلافات کے باوجود ہماری پوری تاریخ میں اتحاد و اتفاق کی ایک ایسی ڈور نظر آتی ہے جو سبھوں کو باندھے ہوئے تھی۔ آج ہمیں سیاسی اتحاد بھی حاصل ہے۔ یہ ہماری بڑی بدنصیبی ہوگی کہ سیاسی اتحاد اور تاریخ کے سکھائے ہوئے پرانے سبق کے باوجود ہم متحد نہ رہ سکیں اور سازش و جارحیت کے لئے دروازے کھول دیں۔ میں یہ بات اس لئے کہتا ہوں کہ معمولی معمولی باتوں کے سلسلے میں ہم اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے جلوس نکالنے اور مظاہرے کرنے لگتے ہیں۔ چونکہ اب ہمارے ملک میں ایک جمہوری دستور نافذ ہے اس لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اپنی باتوں کو کہنے کے لئے کوئی غیر جمہوری یا غیر دستوری طریقہ اختیار کریں۔ ملک کو ہر پانچ سال کے بعد اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر لوگ چاہیں تو پانچ سال گذرنے سے پہلے ہی اپنی رائے ظاہر کرسکتے ہیں۔ اس طرح ہم لوگ اس رابطے کو برقرار رکھ سکتے ہیں جو حکومت اور عام لوگوں کے درمیان ضروری ہے۔ یہی کام دستوری طریقہ کار اور دستوری مشینری کی جڑ ہے۔ لیکن کسی پروگرام کی اچھائی یا برائی کی جانچ کرنے کے لئے چار پانچ برس کا وقت چاہیئے۔ کوئی بھی وزارت جو برسر اقتدار آتی ہے اسے اپنے پروگراموں پر عمل کرنے کے لئے اتنی مدت درکار ہوتی ہی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس پروگرام کو پہلے پورے ملک کی منظوری حاصل ہونی چاہیئے۔ اگر اتفاق سے یہ پالیسی غلط ثابت ہو جائے یا مؤثر طور سے اس پر عمل درآمد نہ ہو سکے تو لوگوں کو یہ اختیار ہوگا کہ حکومت دوسرے لوگوں کو اور کسی دوسری پارٹی کو سونپ دیں۔ ہمارے دستور میں کسی طرح کا کڑا پن نہیں ہے بلکہ اس میں لچک موجود ہے۔ اس کے تحت ہر قسم کے اختلاف رائے کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ دستور ہر فرد کو ہر لحاظ سے مکمل آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کو جمہوری طریقوں اور کارروائیوں کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں سوچنی چاہیئے۔

ہمیں متحد رہنا چاہیئے

ممبران پارلیامنٹ کے علاوہ میں دُوسری قانون ساز مجالس کے ممبروں کو کبھی کبھار ہی خطاب کرتا ہوں۔ دستور کے مُطابق مجھے پارلیامنٹ کو سال میں کم سے کم ایک بار مخاطب کرنا ضروری ہے۔ جیساکہ آپ سب جانتے ہیں میرا خطبہ صرف نام کو میرا ہوتا ہے۔ اور مجھے دہلی میں بھی مجالس قانون ساز کے ممبروں سے خطاب کرنے کا کوئی دوسرا موقع نہیں ملتا۔ اس لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے کوئی تقریر کرنے کے لئے نہیں بلکہ بعض معاملوں کے بارے میں جو مجھے اس وقت نہایت اہم معلوم ہوتے ہیں بات چیت کرنے کا موقعہ فراہم کیا ہے۔

صرف تیرہ سال پہلے ہم نے آزادی حاصل کی ہے۔ تین سال کے بعد ہم نے جمہوریہ کے قیام کا اعلان کیا۔ ان دو تین برسوں میں ہم نے سارے ملک کے لئے ایک دستور بنا لیا۔ انگریز ہمارے ملک کو بہت سے ٹکڑوں میں بٹا ہُوا چھوڑ گئے تھے۔ ملک کی تقسیم اور پاکستان بننے کے بڑے مسئلے کے علاوہ پانچ سو ریاستیں تھیں جن کے اپنے اپنے حکمران تھے جو اپنے ڈھنگ سے ان پر حکومت کرتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ زیادہ تر راجوں نے آزادی ملنے سے پہلے ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ایک دو ریاستیں جو شروع میں شامل نہیں ہوئی تھیں وہ بعد میں شامل ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم جو دستور بنانے لگے وہ صرف ملک کے

---

۱۳ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو مدراس میں مدراس لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبروں سے خطاب۔

ان حصّوں کے لئے نہیں تھا جو پہلے برطانوی حکومت کی براہ راست نگرانی میں تھے بلکہ وہ علاقے بھی اس کے تحت آ گئے جن پر ہندوستانی راجوں کی حکومت تھی۔ اس لئے جب دستور تیار ہو گیا تو ہم نے ملک کو کئی ریاستوں میں بانٹ دیا۔ بعد میں ان ریاستوں کی سرحدوں میں تبدیلیاں ہُوئیں اور میرے خیال میں اب ایسی کوئی ریاست نہیں ہے جو یہ دعویٰ کر سکے وہ اپنی سابق شکل میں جُوں کی توں موجود ہے۔ یا تو ان کے ٹکڑے کر کے مختلف ریاستوں سے ملا دئے گئے یا ان میں کسی دُوسری ریاست کے حصّے ملا دئے گئے ہیں۔ اس طریقے سے ہم پُورے ملک کو ایک دستور اور ایک انتظام کے تحت لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ملک میں ایک پارلیامنٹ ہے جس کا حکم سارے ملک میں چلتا ہے۔ ملک میں ایک مرکزی حکومت ہے جو پُورے ملک کے لئے بہت سے معاملات کے بارے میں قانون بنانے کا اختیار رکھتی ہے۔ بلاشبہ ریاستیں کئی لحاظ سے خود مختار ہیں۔ انھیں بہت سے اہم معاملات میں اختیار کلّی حاصل ہے۔ لیکن مجموعی طور پر پورے ملک کا انتظام ایک ریاست کی طرح کیا جاتا ہے، اور آپ اُسے ایک وحدانی ریاست کہہ لیں، یا وحدانی وفاقی ریاست کہہ لیں یا ایک وفاقی وحدانی ریاست کہہ لیں یا آپ کا جو جی چاہے کہہ لیں۔ ہم نے وہ چیز حاصل کی ہے جو اس سے پہلے اس ملک کے کسی حکمران نے حاصل نہیں کی تھی۔ ہمارے ملک میں اشوک جیسے شہنشاہ گذرے ہیں جن کے زیرِ نگیں مُلک کا ایک بڑا حصّہ تھا۔ ہمارے ملک میں مغل شہنشاہ بھی گذرے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ پورے ملک پر ان کی حکومت تھی۔ بات یہ تھی کہ مقامی حکمران ان شہنشاہوں سے کسی نہ کسی صورت میں اپنی اطاعت کا اظہار کرتے تھے۔ زیادہ تر صورتوں میں یہ برائے نام خراج ادا کرتے تھے۔ ہندوؤں کے رواج کے مطابق جس راجہ کا حکم بغیر کسی رکاوٹ کے سارے ملک میں مانا جاتا ہو اُسے چکرورتی کہتے تھے۔ اس کا چکر سارے ملک میں کسی مزاحمت کے بغیر جا سکتا تھا۔ مغلوں نے بھی اپنی حکومت کے صوبے بنائے

تھے جن کے صوبے دار مرکزی حکومت سے کم و بیش آزاد تھے اور اس سے برائے نام اطاعت کا اظہار کرتے تھے۔

اب ہمیں پہلی بار سیاسی، اتحاد حاصل ہوا ہے۔ بلاشبہ ہماری تاریخ میں اس جغرافیائی وحدت کو ہندوستان کا واضح اور مخصوص نام دیا گیا ہے جو ہمالہ سے شروع ہو کر اس تک پھیلا ہوا ہے اور جس کے پورب اور پچھم کی سرحدیں سمندر ہیں۔ اس خطۂ ارضی کو ہمیشہ ایک اور غیر منقسم سمجھا گیا حالاں کہ اس کے اندر مختلف ریاستیں قائم تھیں۔ لیکن تہذیبی اور مذہبی طور پر پورا ملک ایک تھا۔ بعد میں جب دوسرے مذاہب آئے تب بھی یہ ملک مجموعی طور سے ایک اکائی ہی رہا۔ یہ ملک ایک بنا رہا لیکن سیاسی طور سے نہیں۔ اب سیاسی اور انتظامی اتحاد کا اضافہ اس تہذیبی اتحاد کو استحکام عطا کرے گا۔ لہٰذا ہماری سرگرمیوں کا میدان اس سے کہیں بڑا ہے جو پہلے کبھی بھی ہمارے سامنے تھا۔ اسی طرح ہمارے مواقع میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے اور اسی کے مطابق ہماری ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ خود ہمارے اوپر اور ہمارے اجداد کے اوپر یہ بھاری ذمہ داری عائد تھی لیکن ان سے زیادہ ان کے اوپر عائد ہے جو ہمارے بعد آئیں گے کہ وہ اس اتحاد کو باقی رکھیں اور اسے مستحکم کریں تاکہ کسی وقت اس کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہ رہے۔ بیرونی خطرے تو ہیں ہی، اندرونی خطرے بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے انتشار پسند رجحانات پر قابو پانا ہو گا جس کا اظہار معمولی معمولی موقعوں پر کسی خاص اشتعال انگیزی کے بغیر ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے ملک سے محبت رکھنے والے تمام افراد کو تشویش ہوتی ہے۔ ایک گروہ سے دوسرے گروہ کا کسی قسم کا اختلاف جھگڑے کا باعث بنتا ہے لیکن اگر اس جھگڑے کی وجہ اور اس کے پیچھے جو غرض کارفرما ہے اگر اس کا پتہ چلائیں تو یہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک نظر آئے گا جتنا یہ بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ بہر حال مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن ہمیں ساودھان رہنے اور احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں غفلت، اور کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیئے اور یہ نہیں سوچنا

چاہیئے کیونکہ ہم نے آزادی حاصل کر لی ہے تو ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے خواہ وہ ملک کے کسی حصے سے تعلق رکھتا ہو کہ وہ ہمیشہ اپنے اقوال و افعال اور دوسرے کے ساتھ اپنے رویے میں محتاط رہے خواہ وہ ہمارے نزدیکی ہوں یا پڑوسی ہوں یا دو تین ہزار میل دور رہنے والے بھائی ہوں۔

پچیس سال پہلے بہار میں جو زلزلہ ہوا تھا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہار کے ایک چھوٹے سے حصے کے لئے یہ ایک سانحۂ عظیم تھا۔ لیکن پورے ملک میں اس واقعہ پر جس ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا اس سے مجھے بڑی خوشی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہاں کے مصیبت زدگان کی امداد کے لئے مجھے ملک کے کونے کونے سے نقد اور جنس کی صورت میں عطیے ملے۔ اس سے مجھ میں بڑا حوصلہ پیدا ہوا تھا اور میرے دل میں یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب ہم نے ملک کی ایکتا کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ چاہے رنج اور مصیبت ہو یا خوشی اور مسرت ہم سب ایک دوسرے کے رنج و خوشی میں شریک ہیں۔ جب تک کہ پورے ملک کی ایسی سچی ہمدردی اور محبت ہم اپنے اندر پیدا نہیں کریں گے تو وقتاً فوقتاً ایسی باتیں ہوتی رہیں گی جو ہمیں پریشان کرتی رہیں گی۔ جب کبھی غلطی سے یا اتفاق سے یا کسی کی بے وقوفی یا غلط کاری کی وجہ سے ملک میں یہاں وہاں جھگڑے اور فساد برپا ہو جائیں تو ہم بھائی چارے اور ملک کے مختلف حصوں کو ایک سمجھنے کے پورے اور بھرپور احساس کی بدولت اپنے اوپر قابو پائیں اور خود کو مشتعل ہونے سے روکیں۔

ہم نے ترقی کے پلان بنائے ہیں۔ یہ پلان بارآور ثابت ہوں گے اور ملک کے مختلف حصوں کو فائدہ پہونچائیں گے۔ یقیناً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملک کے ہر حصے اور ہر کونے کو ہر پلان سے فائدہ پہونچا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ یکے بادیگر پنج سالہ پلانوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مقامات کو فائدہ پہونچایا جائے اور جس حد تک ممکن ہو پہونچایا جائے۔ پلانوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمارے معیارِ زندگی

کو اُوپر اُٹھائیں اور ہم سب لوگوں کو اُمید ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کے بہتر اور بھرپور نتائج دیکھ سکیں گے۔ پلانوں کی جو موجودہ صُورت ہے ان کو دیکھتے ہوئے میں یہ نہیں سمجھتا کہ ان کے بارے میں ہمیں قنوطی ہونے یا صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔ جس حد تک ہم نے قدم اُٹھایا ہے ہمیں اچھّی کامیابی ملی ہے اور ہمیں اس سے پُورا فائدہ حاصل نہیں ہوُا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے پلانوں کو کامیاب ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ ہمیں اس کا پھل مل رہا ہے مگر سارے پھل نہیں مل رہے ہیں۔ بلاشبہ ہمارے راستے میں مشکلات ہیں۔ لیکن ہم صحیح راستے پر ہیں اور جو تجربے ہم حاصل کر رہے ہیں اور جو معلومات دُوسرے ملکوں سے ہمیں مل رہی ہیں ان کی مدد سے ہم آگے بڑھتے جائیں گے۔

بہرحال جس بات پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان تمام مادّی خوش حالیوں کے ذریعے ہم اپنے لوگوں کو ہر لحاظ سے خوش اور مطمئن نہیں بنا سکتے۔ اس ملک میں بہت پہلے ہم یہ جان چکے ہیں کہ خوش حالی، دولت اور عیش و آرام کی چیزوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسی ہے جو ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ غربت و افلاس اور ان تمام تکالیف کے باوجود جن سے ہمارے عوام گذرے ہیں انھوں نے کبھی اُمید یا اعتماد کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ ہمیشہ ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ غریب سے غریب آدمی بھی جسے تن ڈھانپنے کو کپڑے تک میّسر نہیں، مسکراتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اسی سے مطمئن ہے۔ اور جب تک ہم میں یہ خوُبی موجود ہے کہ اگر دُکھ اور تکلیف میں بھی ہوں تو خوش اور مطمئن رہیں تب تک ہم زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔

بلاشبہ اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی قناعت کا نتیجہ صرف دکھ،

تکلیف اور غربت ہی ہوتا ہے۔ لیکن ذاتی طور میں اس بات میں یقین نہیں کرتا۔ میرے خیال میں غریبی کا مطلب دُکھ اور تکلیف نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق ہمارے احساسات سے ہے۔ ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ہم نے کیا اور اب اس کا جو بھی نتیجہ نکلے رہے سے برداشت کریں یہ احساس ہمیں اس وقت بھی خوش رکھے گا جب کہ مشکل میں ہوں۔ ہم مادّی ترقی کے خواہش مند ہیں ہم دُنیا کی اچھی چیزیں زیادہ سے زیادہ مقدار میں حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ان چیزوں کے ساتھ ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے مذہب اور کلچر کی بنیادی تعلیمات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے چاہے یہ مذہب اسلام ہو، مسیحت ہو یا ہندو مت۔ اس کا انحصار اب ہم پر ہے اور خاص طور سے آپ لوگوں پر ہے جو عوام کے نمائندے ہیں کہ اُن تک یہ پیغام پہونچائیں۔

قومی زبان

اپنے سیر و سیاحت کے دوران میں میں نے ملک کے کئی حصّوں کو ایک بار سے زیادہ دیکھا ہے۔ میں ان تمام رجحانات کو دیکھتا رہتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے فرائض کو بالکل نہیں سمجھا ہے جو ملک کے تئیں ہم پر واجب ہیں۔ بہت سی جگہوں میں علاقہ پرستی کا اتنا زور ہے کہ دوسرے تمام احساسات اس کے نیچے دب کر رہ گئے

میر نیا پیچ، مدراس میں ۱۵ راگست ۱۹۶۰ء کو پبلک جلسے میں تقریر۔

ہیں۔ دُوسری جگہوں پر ذات پات نے دُوسری باتوں کو دبا رکھا ہے۔ بعض اوقات صُوبہ پرستی ہمیں صحیح راستے سے ہٹا دیتی ہے۔ پھر زبان پرستی ایک دُوسری بُرائی ہے جو ہمیں وحشی بنا دیتی ہے۔

ہمارے ملک میں بہُت سی ریاستیں ہیں جن کی اپنی خصوصیتیں اور اپنی شخصیتیں ہیں لیکن مجموعی طور سے ہم ایک ہندوستانی قوم ہیں جس میں تمام ریاستیں اور ریاستوں کی ساری شخصیتیں شامل ہیں۔ ہمارے دستور میں ہر ریاست کو اس کا پُورا موقعہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے طریقے سے اور اپنی شخصیت کے مطابق پُوری پُوری ترقی کرے۔ دستور میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ تمام ریاستیں ایک ساتھ مل کر کام کریں تاکہ ملک مجموعی طور سے پھلے پھُولے اور خوش حال بنے۔ اس لئے ہر ریاست پر دُو طرح کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک ذمہ داری تو مرکزی حکومت کے تئیں ہے اور دُوسری اور اتنی ہی اہم ذمہ داری اسے اپنی اقلیتوں اور اپنے لوگوں کے بارے میں ہے۔ ایک ریاست اسی وقت خوش حال ہوسکتی ہے جب وہ اپنی دونوں ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے پُورا کرے۔ ریاست کی اپنے تئیں جو ذمہ داریاں ہیں اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے یہاں رہنے والی اقلیت کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ ایسی جگہیں موجود ہیں جہاں ذات پات نے بڑی خرابیاں پیدا کر رکھی ہیں اور دستور کی دفعات جو سبھوں کو فائدہ پہونچانے کے لئے بنائی گئی ہیں وہ بعض اوقات مخصوص گروہوں کے مفاد کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ ایسے گروہ مذہبی بھی ہوسکتے ہیں، ذات پات کے بھی یا لسانی بھی۔ یقیناً یہ ضروری ہے کہ اس ریاست کی زبان یعنی وہ زبان جو وہاں کی اکثریت استعمال کرتی ہے اس کو ریاست کے انتظام اور تعلیمی معاملوں میں اس کی جائز جگہ ملنی چاہیئے لیکن یہ بات اتنی ہی ضروری ہے کہ ریاست میں جو لوگ اقلیت میں ہیں یعنی جو لسانی اقلیت ہے اس کو اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھنا چاہیئے۔

حال میں کچھ بڑے ناخوشگوار واقعات ہوئے ہیں۔ میں تمام باتوں سے پوری طرح باخبر نہیں ہوں کہ پورے یقین سے کچھ کہہ سکوں، لیکن غالباً ان تمام واقعات کی تہ میں بڑے پیمانے پر نہایت تنگ قسم کے لسانی جذبات کام کر رہے تھے۔ ممکن ہے کہ کچھ شکایتیں سرکاری نوکریوں سے متعلق بھی ہوں۔ لہذا ہمیں ہمیشہ یہ احتیاط کرنی چاہیئے کہ ایسی کوئی بات کسی کے لئے تکلیف اور پریشانی کا باعث نہ بنے۔ ہمارے دستور کے علاوہ انتظامیہ کی طرف سے جاری کئے گئے احکام کے ذریعے چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کو ان کی زبان کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے تاکہ ان کے بچے کم سے کم ابتدائی درجوں میں اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ اسی طرح اس بات کا خیال بھی رکھا گیا ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں ہر شخص کو اس کا پورا حصہ ملے۔ لیکن اس سلسلے میں ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ سرکاری نوکریاں ہی ملازمت کا واحد ذریعہ نہیں ہیں۔ ہماری صنعتوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ سرکاری نوکریوں پر انحصار بتدریج کم ہوتا جائے گا۔ جب تک کہ وہ منزل نہ آجائے اس کا خیال رکھا جائے کہ کسی شخص کو محض اس وجہ سے شکایت کا موقع نہ ملے کہ اس کا تعلق کسی اقلیتی گروپ سے ہے اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے سلسلے میں تو یہ شکایت بالکل نہیں ہونی چاہیئے کہ چوں کہ کسی کا تعلق اقلیتی گروپ سے ہے اس لئے کوئی دقت پیش آرہی ہے۔ یہ تو اپنے شہریوں کے متعلق ریاست کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ریاست پر مرکز سے متعلق بھی ذمہ داری عائد ہے۔ اس کے بارے میں دستور میں دفعات موجود ہیں جن میں ریاست اور مرکز کے حقوق اور ذمہ داریوں کی صراحت کر دی گئی ہے۔

چوں کہ زبان کا مسئلہ بہت سے دماغوں میں ہیجان پیدا کئے ہوئے ہے اس لئے میں اس مسئلے پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالوں گا۔ جس وقت ہم آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے اس وقت مہاتما گاندھی نے محسوس کیا تھا کہ ہمیں ملک گیر زبان کے مسئلے کو حل کرنا ہوگا۔ ہمارے ملک میں بہت سی زبانیں ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں بولی

جاتی ہیں۔ اور چوں کہ ہم نے محسوس کیا کہ ہر زبان اس لائق ہے کہ اسے بھرپور ترقی کا موقع دیا جائے اس نے کانگرس کے پہلے ہی اجلاس میں جس پر ہمارا اختیار تھا ہم نے کانگرس کے دستور میں ترمیم کر ڈالا۔ ۱۹۲۰ء میں ناگ پور میں جو کانگرس کا اجلاس ہوا تھا اس میں کانگرس کے لئے لسانی صوبوں کی تشکیل کر دی گئی تھی۔ حتیٰ کہ ان ریاستوں میں جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں کانگرس نے کئی صوبے بنا رکھے تھے۔ آپ میں سے جو لوگ عمر رسیدہ ہیں انھیں یہ واقعات یاد ہوں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس ریاست میں بھی تامل زبان اور تلگو زبان بولی جاتی ہے۔ اس ریاست کے کچھ حصوں میں ملیالم اور کنڑ بھی بولی جاتی ہے۔ انتظامی لحاظ سے تو یہ ایک صوبہ تھا لیکن کانگرس کے لئے اس کے اندر کئی صوبے تھے۔ اسی طرح بمبئی میں نہ صرف مراٹھی اور گجراتی بولی جاتی ہے بلکہ کنڑ بھی رائج ہے اور کانگرس کے لئے اس ریاست میں بھی کئی صوبے تھے۔

لہٰذا لسانی صوبے بنانے کا خیال کچھ موجودہ حکومت کی اختراع نہیں ہے۔ لسانی صوبوں کا تصور مہاتما گاندھی کا عطا کردہ ہے۔ موجودہ حکومت نے صرف قانون بنا کے اسے عملی جامہ پہنایا ہے۔ لسانی صوبے بنانے کے پیچھے یہ مقصد تھا کہ مختلف صوبوں کی زبانوں کو بھرپور ترقی کے مواقع ملیں۔ حتیٰ کہ ہماری یونیورسٹیاں بھی جو اس معاملے میں بڑی قدامت پرست ہیں وہ بھی اب رفتہ رفتہ اپنے نصابِ تعلیم میں ہندوستانی زبانوں کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہیں۔ بہت سی یونیورسٹیوں نے جزوی طور سے ریاستی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہے حالاں کہ فی الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمام یونیورسٹیوں نے اونچے درجوں تک کے لئے علاقائی زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہے لیکن وہ دن دور نہیں ہے جب انھیں ایسا کرنا پڑے گا۔

صرف تعلیمی مقاصد کے لئے ہی نہیں بلکہ انتظامی امور میں بھی صوبائی زبانوں کو مناسب جگہ دینی ہوگی۔ انتظامیہ کی نچلی سطح پر تو صوبائی زبانیں ہمیشہ استعمال کی جاتی رہی ہیں لیکن

اب انھیں اونچی سطح پر بھی زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور ایک دن ہر ریاست میں وہاں کی علاقائی زبان تمام انتظامی کاموں کے لئے استعمال ہونے لگے گی۔ گاندھی جی بالکل یہی چاہتے تھے۔

لیکن گاندھی جی نے سارے ملک کے لئے ایک زبان کے بارے میں بھی سوچا تھا اور قدرتی طور سے انھوں نے ہندی کے بارے میں سوچا تھا۔ میں قدرتی طور سے اس لئے کہتا ہوں کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہندی بولتی ہے اور کوئی دوسری زبان بولنے والوں کی تعداد اتنی نہیں ہے۔ جب لوگ ہندی سامراجیت کی باتیں کرتے ہیں۔ تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ ہندی کو سارے بھارت کی بھاشا بنانے کا خیال کسی ہندی علاقے کے شخص کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان کے دو شخص ہندی کو کل ہند کی زبان کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔ اور ہندی دونوں میں سے کسی کی زبان نہیں تھی۔ گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں سوامی دیانند نے محسوس کیا کہ ہندو دھرم کے متعلق ان کا جو اپنا نظریہ ہے اگر وہ اس کو پھیلانا چاہتے ہیں تو انھیں ہندی کا سہارا لینا ضروری ہے۔ ان کا تعلق کسی ایسے صوبے سے نہیں تھا جہاں کی زبان ہندی ہو۔ وہ کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے۔ اور پچاس سال کے بعد مہاتما گاندھی نے بھی یہی کام اپنے ہاتھوں میں لیا۔ حالاں کہ وہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں روانی سے ہندی بول لیتے تھے اور بڑے بڑے مجمع سے ہندی میں خطاب کرتے تھے لیکن مجھے وہ دن یاد ہے جب کہ وہ رک رک کے ہندی بولتے تھے اور روانی کے ساتھ ہندی میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ جنوبی افریقہ میں ہی انھوں نے یہ بات سوچ لی تھی کہ پورے ملک میں ایک دوسرے سے مراسلت کی زبان صرف ہندی ہی ہو سکتی ہے۔ وہاں بھی وہ ان لوگوں کے سامنے، جن میں تامل زبان بولنے والے بھی تھے، اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں تقریر کرتے تھے۔ اور جب ۱۹۱۷ء میں وہ چمپارن آئے

تھے تو وہ ہندی کے صرف چند ہی لفظ بول پاتے تھے۔ لیکن وہ ہر لحاظ سے ایک عملی انسان تھے۔ لہٰذا انھوں نے ہمیں کہا کہ وہ اپنی ہندی پر اصرار نہیں کریں گے بلکہ وہ ہم سے انگریزی میں باتیں کریں گے اور ہماری باتیں بھی انگریزی میں سُنیں گے اور جو کچھ کام ہم نے وہاں کیا اس کا بڑا حصّہ انگریزی کے ذریعے کیا گیا۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ ان نزدیک کام کی اہمیت زیادہ تھی اس لئے انگریزی کا سہارا لینا پڑا۔ اس لئے نہیں کہ انھوں نے ہندی کو پورے ہندوستان میں استعمال ہونے والی زبان بنانے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ انھوں نے وہاں سے اپنے بیٹے اور سوامی ستیہ دیو کو مدراس میں ہندی کے پرچار کے لئے بھیجا اور ہندی پرچار سبھا کی بُنیاد اس وقت پڑی۔ یہ بُنیاد کسی ہندی بولنے والے شخص کے ہاتھوں نہیں رکھی گئی بلکہ مہاتما گاندھی اور ان کے بیٹے کے ذریعے رکھی گئی۔

اس لئے یہ سوچنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندی بولنے والے لوگ آپ پر کوئی زبان لادنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہم لوگ بھی اسی حد تک عملی آدمی ہیں جس حد تک مہاتما گاندھی تھے۔ اور جیسے کہ وہ انگریزی میں کام کرنے کے لئے رضامند ہو گئے تھے کیونکہ ان کے نزدیک کام کی اہمیت زیادہ تھی لہٰذا ہم لوگ اب تک اپنا کام انگریزی سے چلاتے ہیں۔ اور نہایت باوثوق طریقے سے یہ بتا دیا گیا ہے کہ ہم اس وقت تک ایسا کرتے رہیں گے جب تک کہ آپ چاہیں گے لیکن کیا میں ایک بات آپ سے پُوچھ سکتا ہوں؟ آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے احساسات و جذبات کی قدر کریں اور ہم کرتے ہیں۔ ہم آپ پر کوئی چیز لادنا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ ایک ہندوستانی زبان بھی نہیں۔ اس لئے براہ مہربانی آپ ہم پر کوئی غیر ملکی لادنے کی خواہش نہ کریں۔ ہم دوسروں کے جذبات کا پُورا لحاظ کر رہے ہیں اور کسی حال میں آپ پر ہندی مسلّط نہیں کریں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی نرمی سے کام لیں گے اور ہم پر انگریزی مسلّط نہیں کریں گے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ ملک کے ان حصّوں میں ہندی تیزی

کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں کے لوگوں نے انگریزی کے بجائے ہندی زیادہ تعداد میں سیکھی ہے۔ ان علاقوں میں ہندی پرچار نے ستر لاکھ سے زائد مردوں اور عورتوں کو ہندی کی تعلیم دی ہے۔ پندرہ لاکھ کے قریب اس کے امتحانوں میں شریک ہوئے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کتنے آدمیوں انگریزی کے امتحان پاس کئے ہیں۔ میں یہ پوچھ کر آپ کو پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتا کہ آپ میں سے کتنے ہندی اور کتنے انگریزی جانتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ ان معاملوں میں شمالی ہندوستان کے لوگ بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر انھوں نے ہندی کے مسئلے کا حل جنوبی ہندوستان کے لوگوں پر چھوڑ دیا ہوتا تو ہم نے اس سلسلے میں اب تک زیادہ ترقی کرلی ہوتی۔ پڑھنے لکھنے کے لئے جس طریقے سے ہندی اپنائی اور منظور کی گئی ہے وہ مجھے بڑا اُمید افزا نظر آتا ہے اور اُمید بندھتی ہے کہ آپ دُوسرے مقاصد کے لئے بھی ہندی اختیار کریں گے اور میں چاہتا ہوں کہ شمالی ہندوستان کے لوگ بھی یہ محسوس کریں وہ صرف اپنی مرضی کے مطابق اور جنوبی ہندوستان کے لوگوں سے صلاح مشورہ اور ان کی منظوری حاصل کئے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ اقلیت کی خواہشوں کا احترام کرنا ہمارے دستور کی اساسی باتوں میں سے ایک ہے۔ لیکن ہم صرف انتظامی مقاصد کے لئے ہندی یا کسی دُوسری ہندوستانی زبان کا مطالعہ کرانا نہیں چاہتے۔ یہ ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصّوں کے لوگ ایک دُوسرے کو اس سے کہیں زیادہ بہتر طور پر سمجھیں جتنا وہ آج سمجھتے ہیں اور لوگوں کے دلوں تک پہنچنے کا وسیلہ ان کی زبان ہے۔ میں ایک ہندی بولنے والا آدمی ہوں۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے بنگال اور کلکتہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا میں نے اس وقت تھوڑی بہت بنگلہ سیکھی تھی۔ چند سال پہلے جب مجھے کانووکیشن ایڈریس دینے کے لئے

کلکتہ بلایا گیا تو میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی بنگلہ میں تقریر کی ۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو کچھ میں نے کہا اُس میں کوئی بڑی قابلِ قدر بات تھی ۔ لیکن اس کا ایک بڑا فائدہ ہوا کہ یہ بات بنگالیوں کے دلوں میں اُتر گئی ۔

مَیں چاہتا ہوں کہ شمالی ہندوستان کے لوگ جنوبی ہندوستان کی زبانیں سیکھیں ہر آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کئی زبانیں سیکھے ۔ لیکن ایک زبان سے دُوسرے زبان میں ترجمہ کرنا ممکن ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب لوگ زبانیں سیکھیں ۔ اس سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ جب لوگ ملک میں گھومے پھریں تو لوگوں سے ان کی بھاشا میں بات کریں اپنے ملک کو دیکھیں اور سمجھیں اور ایسا نہ ہو کہ وہ انگریزی بولتے ہوئے بیگانہ روی سے ملک کے مختلف حصّوں سے گزر جائیں ۔ جب تک آپ ہم سے ہندی میں بات نہ کر سکیں بہتر یہی ہے کہ آپ اپنی زبان میں بات کریں اور ہمارا انتظام یہ ہونا چاہیئے کہ مترجموں کے ذریعے آپ کے خیالات عام لوگوں تک پہونچائیں ۔ اگر میں ہندی میں تقریر کرتا تو آپ میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس کا ترجمہ تامل میں کر سکتے تھے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا ۔ ایسا میں نے صرف آپ کے احترام کے خیال سے کیا ہے ۔ واقعی مجھے ڈر تھا کہ اگر میں ایسا کروں گا تو آپ مجھ پر امپیریلزم (سامراجیت) کا الزام لگائیں گے ۔ ساری زندگی ہم سامراج کے خلاف لڑتے رہے ہیں ۔ براہِ مہربانی یہ نہ سمجھئے کہ ہم اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کسی قسم کی سامراجیت کے مرتکب ہوں گے ۔

مجھے ڈر ہے کہ مَیں جس موضوع پر کچھ باتیں کہنی چاہتا تھا اس سے ہٹ گیا ہوں اصل نکتہ یہ ہے کہ ہم ملک میں اتحاد اور ایکتا چاہتے ہیں ۔ صوبہ پرستی، ذات پات کا بھید بھاؤ، اور لسانی احساسات کو دیش بھگتی اور اس کے پریم کے ماتحت ہونا چاہیئے اور مجھے قوی اُمید ہے کہ رفتہ رفتہ حُبّ الوطنی کے جذبات آپ کو ہندی اپنا لینے پر

مجبور کردیں گے۔ میں شمالی ہندوستان کے دوستوں سے کہہ سکتا ہوں کہ جب آپ ہندی کو اپنا لیں گے تو انھیں ہوشیار ہو جانا چاہیئے کیوں کہ امتحانوں میں آپ اُنھیں پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ آپ نے انگریزی میں اتنا کمال حاصل کیا کہ انگریزوں کو مات دے دی اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندی میں بھی آپ ہندی بولنے والوں کو ہرا دیں گے اس لیئے جو کوئی بھی مرکزی حکومت کی ملازمت میں داخل ہونا چاہتا ہے اُسے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ لیکن جب تک یہ ڈر ہے خواہ یہ کتنا ہی بے بُنیاد کیوں نہ ہو ہمیں اس کا لحاظ کرنا ہوگا۔

انتشار پھیلانے والی طاقتوں کو روک دیجئے

قومی تعمیر کی سرگرمیوں میں روز بروز جو اضافہ ہوتا جا رہا ہے اسے دیکھ کر ہمیں بڑا اطمینان ہوتا ہے اور ہم سب اِس بات پر مُتفق ہیں کہ اس کی وجہ سے ہمارے ملک کی شکل وصُورت اور خصوصاً دیہی ہندوستان کی حالت تیزی سے بدل رہی ہے۔ ہر سال ہماری صنعتی اور زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے قومی وسیلوں کو ترقّی دینے کے لیئے جو نشانے ہمارے پنج سالہ پلانوں میں مُقرّر کیئے گئے ہیں وہ پُورے ہوتے جا رہے ہیں۔ بنیادیں ڈالی جا رہی ہیں اور ہم اس اُمید اور اعتماد کے ساتھ مستقبل پر نظر ڈال سکتے

---

۱۵ اگست ۱۹۶۰ء کو یومِ آزادی کے موقع پر مدراس سے قوم کو خطاب۔

ہیں کہ ہمارے پلانوں کے مقاصد بتدریج پورے ہوتے جارہے ہیں۔

بہرحال میں تمیرلو کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ کہنے کا ارادہ نہیں رکھتا خواہ یہ بات کتنی ہی خوش گوار اور اطمینان بخش کیوں نہ ہو۔ بلکہ اس کے بجائے میں ان افسوس ناک رجحانات کے ذکر کرنے کا ناخوش گوار فرض انجام دوں گا جنھوں نے ہماری آئندہ خوشی اور خوش حالی کے بارے میں بہت سے محب وطن ہندستانیوں کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اگر ان رجحانات کو وقت پر قابو میں نہ کیا گیا تو ان میں اتنی صلاحیت ہے کہ ہم نے صنعت اور دوسری قومی سرگرمیوں کے میدان میں جو ترقیاں کی ہیں وہ انھیں بالکل ختم کردیں۔ لہذا ملک کے ہر بہی خواہ کا یہ پہلا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ انتشار پھیلانے سے ان طاقتوں کو بڑھنے نہ دے تاکہ جو آزادی ہم نے صدیوں کی غلامی کے بعد حاصل کی ہے اور اپنی معشیت اور سماجی ڈھانچے کو بدلنے اور نئے سانچے میں ڈھالنے کا موقع ملا ہے وہ چھن نہ جائے۔

لہذا مجھے اس پر زور دینا ہے کہ ہمیں اختلافات اور ایک دوسرے سے الگ کرنے والی تمام باتوں کو خیرسگالی، مفاہمت اور رواداری کے ذریعے ختم کرکے ایکتا اور میل ملاپ پیدا کرنے والی طاقتوں کو مضبوط کرنا چاہیئے۔ ماضی قریب میں ہم نے کچھ ایسے افسوس ناک واقعے دیکھے ہیں جن کا ذکر ہی مجھے اتنا رنجیدہ کردیتا ہے کہ الفاظ میں انھیں بیان نہیں کرسکتا۔ اس واقعے کا پس منظر، پہلے سے پیدا شدہ حالات ہوں یا مشتعل کرنے والی کوئی فوری وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن ہماری عقل اور سمجھ اور قوم پرستی کے جذبات کے اوپر تناؤ اور تنافر نے جو غلبہ پالیا اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ایسے واقعات الگ تھلگ رہنے کے احساسات کو تقویت پہونچاتے ہیں اور تلخی پیدا کردیتے ہیں اور اس طرح ملک کے اتحاد و اتفاق کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ چاہے یہ مذہب کا سوال ہو یا بھاشا کا یا ہماری زندگی سے متعلق کوئی اور پہلو ہو تشدد کے استعمال کبھی بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کے لوگوں

سے اپیل کروں گا کہ وہ وسیع النظری سے کام لیں اور معاملات کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ صحیح نقطۂ نظر اور باہمی رواداری کے بدولت ہمیں پھر ایسے مناظر دکھائی نہ دیں گے جیسے کہ بدقسمتی سے ہمیں ملک کے بعض حصّوں میں ابھی حال میں دیکھنے پڑے ہیں۔ ہماری سرحدوں پر جو تناؤ ہے اور ہمیں جو خطرات درپیش ہیں وہ متحد ہونے کی خواہش کو مزید استحکام بخشیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ یومِ آزادی کے موقع پر ایسی باتیں کہنا معمول کے مطابق نہیں ہے۔ میں نے ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ ہم خرابیوں کو دُور کرنے اور اپنے حالات کو درست کرنے کے لئے خلوص کے ساتھ اقدامات کریں اور جن رجحانات کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے اور ان کو وقت پر قابو میں لانے کے لئے میری جو دلی خواہش ہے اس کا بھی اظہار ہو جائے۔